

اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان، بہت رحم والا ہے

براہین و معجزات کا انسائیکلو پیڈیا

محمد ﷺ کی نبوت اور قرآن کریم کی سچائی کے دلائل

سائنسی معجزات · تاریخی و آثاری شواہد · پوری ہونے والی پیشین گوئیاں

تورات و انجیل کی بشارتیں · جن، جادو اور غیب کی دنیا

۱۵۷ آسانی سے سمجھایا گیا کہ بچہ بھی سمجھ لے · ۱۵۷ رنگین خاکے

۱۵۷ دلائل، قوت کی ترتیب سے

شروع کرنے سے پہلے... یہ پڑھ لیجیے

یہ کتاب بحث و جدال کی کتاب نہیں۔ یہ پیشکش کی کتاب ہے: ہم دلیل آپ کے سامنے رکھتے ہیں، نہایت سادگی سے اُسے کھول کر بیان کرتے ہیں، پھر فیصلہ آپ کی عقل پر چھوڑ دیتے ہیں۔

ہر صفحہ کیسے پڑھیں؟

- سنہری حاشیے کے اندر کا متن – قرآن کی کوئی آیت، یا نبی ﷺ کی کوئی حدیث، یا کسی پرانی کتاب کا کوئی اقتباس۔
- رنگین خاکہ – ایک تصویر جو بات کو بغیر الفاظ کے سمجھا دیتی ہے۔
- آسان لفظوں میں – پوری بات دو سطروں میں، گویا ہم اُسے دس سال کے بچے کو سمجھا رہے ہوں۔
- اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟ – جس دن یہ متن اُترا، اُس دن پوری دنیا کا حال۔
- آج سائنس کیا کہتی ہے؟ – وہ کچھ جو اِس کے صدیوں بعد دریافت ہوا۔
- یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟ – وہ نتیجہ جس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ ہم «فلاں مفسر نے یوں کہا» کہہ کر بات لمبی نہیں کرتے۔ وجہ سیدھی سی ہے: پہلے مفسرین، اللہ اُن پر رحم کرے، متن کی تشریح اپنے زمانے کے اوزاروں سے کرتے تھے، اور اُن کے پاس نہ دوربینیں تھیں نہ خوردبینیں۔ یہ بالکل فطری ہے کہ وہ اُس باریک مفہوم تک نہ پہنچیں جو اُن کے ہزار برس بعد تک دریافت ہی نہ ہوا۔ اِس سے اُن کی قدر میں ذرا کمی نہیں آتی – بلکہ یہی تو خود دلیل ہے: اگر یہ متن کسی انسان کی طرف سے ہوتا تو اِس میں ایسا مفہوم نہ ہوتا جسے سمجھنے سے اُس کے زمانے کے ذہین ترین لوگ عاجز رہ جاتے۔

«ہم عنقریب اُنہیں اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اُن کے نفسوں میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے کہ یہی حق ہے۔»

«معجزہ» کا اصل مطلب کیا ہے؟

معجزہ محض کوئی عجیب سی چیز نہیں۔ معجزہ وہ کام ہے جس کی مثل لانے سے انسان عاجز ہوں، جو کسی نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو، تاکہ اس بات کی نشانی بنے کہ اُسے بھیجنے والا ہی کائنات کا خالق ہے۔

بچے کو یوں مثال دیجیے

تصور کیجیے کہ پہلی جماعت کا کوئی بچہ تختے پر ایسی مساوات لکھ دے جسے یونیورسٹی کے پروفیسروں کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو، اور ہزار برس بعد کھلے کہ وہ بالکل درست تھی۔ آپ یہ نہ کہیں گے: «کیسا ذہین بچہ ہے!» بلکہ آپ کہیں گے: «یہ اُسے لکھوایا کس نے؟» قرآن کا معاملہ بعینہ یہی ہے۔

تین شرطیں جن کی پابندی ہم ہر صفحے پر کرتے ہیں

- **متن دریافت سے پہلے کا ثابت شدہ ہے۔** قرآن چودہ صدیوں سے لکھا ہوا، محفوظ اور تواتر سے منقول چلا آ رہا ہے، اور ہمارے پاس کاربن سے تاریخ شدہ مخطوطات ہیں جو اسے ثابت کرتے ہیں۔ تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا: «یہ دریافت کے بعد لکھا گیا»۔
- **مفہوم خود لفظ میں کھلا ہوا ہے۔** ہم کسی لفظ کی گردن نہیں مروڑتے؛ وہی عربی معنی لیتے ہیں جو لغتوں میں معروف ہے۔
- **اُس زمانے کے لوگ اس کے اُلٹ کے قائل تھے۔** اور اس باب میں سب سے مضبوط بات یہی ہے: متن نے اپنے عہد کی ثقافت کی موافقت نہیں کی، بلکہ اُس کی مخالفت کی، پھر کھلا کہ درست وہی تھا۔

«کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔»

فہرست

عظیم براہین

1

81 دلائل ص 5

نبی ﷺ کی وہ پیشین گوئیاں جو پوری ہوئیں

2

19 دلائل ص 87

تورات و انجیل کی بشارتیں

3

11 دلائل ص 107

نبی ﷺ کے حسی معجزات

4

16 دلائل ص 119

جن، جادو اور غیب کی دنیا

5

18 دلائل ص 136

زبان کا اعجاز اور چیلنج

6

12 دلائل ص 155

کل: 6 ابواب میں 157 دلائل



پہلا باب

عظیم براہین

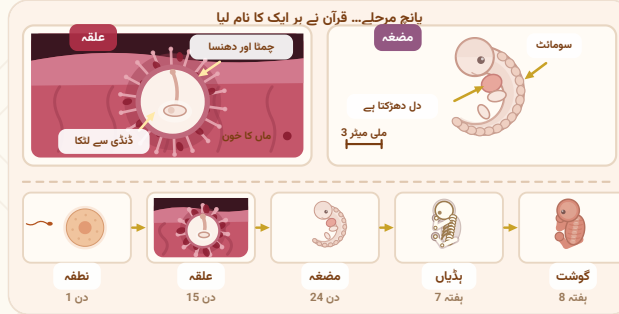
کتاب کا نچوڑ: کائنات، زمین اور انسان کی نشانیاں اور تاریخ کے شواہد، سب ایک ہی باب میں جمع، اور سب سے مضبوط دلیل سے ہلکی دلیل کی طرف ترتیب دیے گئے۔ جو آپ سب سے پہلے پڑھیں گے وہی ہے جس سے بچ نکلنا ممکن نہیں؛ اور جوں جوں آپ باب میں آگے بڑھیں گے، دلیل کا وزن کچھ ہلکا ہوتا جائے گا۔

81 دلائل

پانچ مرحلے... ٹھیک ترتیب کے ساتھ

پھر ہم نے نطفے کو علقہ بنایا، پھر علقے کو مضغہ بنایا، پھر مضغے کو ہڈیاں بنایا، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا

سورہ المؤمنون - آیت 14



کارٹینی مراحل اور جنین کی اصل تصویروں پر بنایا گیا خاکہ - وہی تناسب، وہی پیمانہ۔ نام اور ترتیب بعینہ وہی جو آج کی طبی کتابیں دیتی ہیں

آسان لفظوں میں

پانچ مرحلے، جن کے نام قرآن نے چودہ صدیاں پہلے ایک ایک کر کے لیے: بانی کا ایک قطرہ، پھر **علقہ** - وہ چیز جو رحم کی دیوار میں پیوست ہو جاتی ہے اور پھر اُس میں یوں لٹکی رہتی ہے جیسے پھل ٹہنی سے، پھر **مضغہ** - ایک چھوٹا سا ٹکڑا جس پر ایسے نشان ہیں **گویا دانتوں نے اُسے چبایا ہو**، پھر ہڈیاں جو ڈالی جاتی ہیں، پھر گوشت جو ہڈیوں کو ڈھانپ دیتا ہے۔ اوپر کا خاکہ **خود جنینوں کی تصویروں سے اُتارا گیا ہے** - اپنی آنکھ سے دیکھیے، پھر لوٹ کر آیت دوبارہ پڑھیے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

رحم کے اندر کیا ہوتا ہے، اس کا کچھ علم نہ تھا۔ غالب رائے - ارسطو کی، اور اُس کے بعد آنے والے ہر شخص کی - یہ تھی کہ جنین **حیض کے جمع ہوئے خون** سے بنتا ہے۔ جالینوس نے جنین کے بننے کو مرحلوں میں بانٹا اور گوشت کو یوں بیان کیا کہ وہ **ہڈیوں پر اور اُن کے گرد اُگتا ہے** - مگر اُس نے کبھی کوئی انسانی رحم نہ کھولا؛ اُس نے یہ سب جانوروں کی تشریح اور نظری قیاس پر کھڑا کیا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

علقہ - تقریباً پہلے دو ہفتے: تین مستند حقیقتیں ایک ساتھ پیش آتی ہیں: جنینی کیسہ رحم کی دیوار سے چمٹتا ہے اور اُس میں دھنستا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کے بافت میں دفن ہو جاتا ہے؛ پھر وہ اپنی تھیلی کے اندر ایک جوڑنے والی ڈنڈی سے لٹکا رہتا ہے - یہی آپ اوپر کے خاکے میں دیکھ رہے ہیں؛ اور اُس کے گرد ایسے خلا کھلتے ہیں جنہیں **ماں کا خون بھر دیتا ہے**، سو وہ اُس میں گھر جاتا ہے۔
مضغہ - تقریباً چوتھا ہفتہ: جنین کی پشت پر ایسے ٹکڑے نمودار ہوتے ہیں جنہیں **سومانٹ** کہتے ہیں، جو ایک کے بعد ایک بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ چالیس جوڑوں کے قریب پہنچ جاتے ہیں، اور اُن کے بیچ گہری دراڑیں ہوتی ہیں، سو اُس کی سطح نشان دار دکھائی دیتی ہے - اور اُس دن اُس کی لمبائی تین ملی میٹر ہے، جو بغیر تکبیر کے نظر ہی نہیں آتی۔
پھر ہڈیاں، پھر گوشت: ڈھانچہ پہلے غضروفی سانچوں کی صورت میں ڈالا جاتا ہے، پھر پٹھے اُس کے گرد لپٹ کر اپنی شکل اُسی سے لیتے ہیں - پہلے سے موجود کسی چیز پر پوشش، بالکل ویسے ہی جیسے اُس نے فرمایا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ان دو لفظوں کے پاس ٹھہریے، ان پر سرسری نہ گزریے۔ **صرف دو لفظ** - «علقہ» اور «مضغہ» - نے اُس چیز کو بیان کیا جس پر کسی انسان کی آنکھ چودہ صدیوں تک نہ پڑی، اور پھر بھی خوردبین اور کیمیرے ہی کے ذریعے۔
پہلا: «علقہ»۔ اور اسے مجھ سے نہ لیجیے - لغتوں سے لیجیے۔ جوہری نے «الصحاب» میں لکھا، اور وہ ہزار برس پہلے وفات پا چکے: «اور علقہ پانی کا وہ کیڑا ہے جو خون چوستا ہے»۔ بعینہ یہی الفاظ «لسان العرب» میں موجود ہیں۔ اور خود اس لفظ کا مادہ **پیوست ہونے اور چمٹنے** پر گھومتا ہے، اور **لٹکنے اور معلق رہنے** پر۔
اب نظر اٹھائیے اس صفحے کے اوپر والے خاکے کی طرف۔ آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ ایک ایسی مخلوق دیکھ رہے ہیں جو رحم کی دیوار میں **پیوست ہوئی** اور اُس میں اس قدر دھنسی کہ اُس کے گوشت میں چھپ گئی؛ پھر اپنی تھیلی کے اندر ایک ڈنڈی سے **لٹک گئی**، جیسے پھل ٹہنی سے لٹکتا ہے؛ اور **اُس کی ماں کا خون ہر طرف سے اُسے گھیرے ہوئے ہے**۔ ایک ہی نام نے تینوں کو ایک ساتھ جا لیا۔ **تو کس نے اُسے خبر دی؟**
دوسرا: «مضغہ»۔ اور یہ **چبانے** سے ہے۔ خالد بن جنہ کہتے ہیں، جیسا کہ «لسان العرب» میں ہے: «گوشت کا مضغہ اُتنا ہے جتنا آدمی اپنے منہ میں ڈالتا ہے» - ایک لقمہ جو چپایا جائے۔ پھر چودہ صدیاں بعد خوردبین آتی ہے اور چوتھے ہفتے کے جنین کی تصویر لیتی ہے، اور جامعہ کی درسی کتاب «نمو پاتا ہوا انسان» کہتی ہے کہ یہ ٹکڑے اُس کی پشت پر **باہر سے موتیوں جیسے ابھار دکھائی دیتے ہیں**، اور اُن کے بیچ گہری دراڑیں ہیں۔ خاکے کو دیکھیے: گویا دو جبرڑوں کے بیچ دبایا گیا ہو؛ اور یاد رکھیے کہ اُس دن اُس کی لمبائی **تین ملی میٹر** ہے - نہ کوئی آنکھ اُسے دیکھتی ہے، اور نہ اُس کی شکل ایسی تکبیر کے بغیر پہچانی جا سکتی ہے جو اُس دن پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔
اور تیسرا: ہڈیاں، پھر گوشت۔ کون سا انسان کسی نرم لوتھڑے کو دیکھ کر کہے گا: پہلے ہڈی؟! عقل تو اس کے اُلٹ کہتی ہے۔ مگر علم کہتا ہے: ہاں، ڈھانچہ پہلے ڈالا جاتا ہے، پھر پٹھے اُس کے گرد لپٹ کر اپنی شکل اُسی سے لیتے ہیں۔ اور یہ بعینہ اُس کا فرمان ہے: «**پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا**» - اور پوشش تو اُسی پر پڑتی ہے جو پہلے سے موجود ہو!

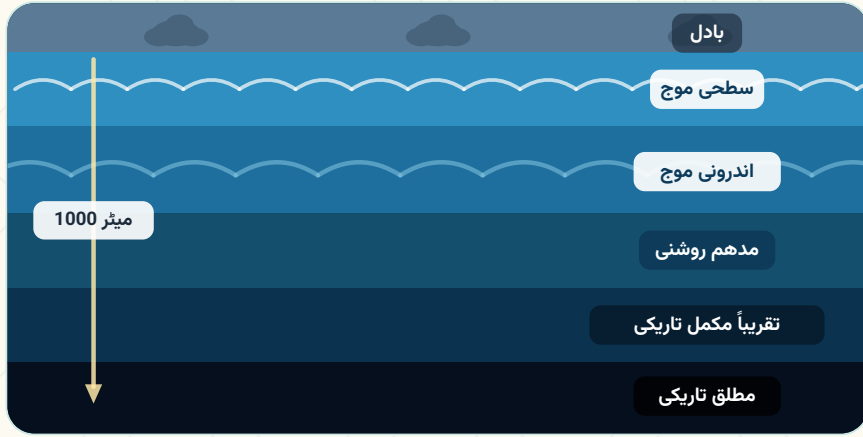
ایک ہی آیت میں چار پے در پے لفظ۔ **چار پے در پے ضربیں**۔ ان میں سے ہر ایک تنہا کافی تھی کہ اگر چوک جاتی تو پورے متن کو گرا دیتی - اور ایک بھی نہ چوکی۔ ریگستان کا ایک اُمی شخص، جو نہ پڑھتا تھا نہ لکھتا، ایسے مرحلوں کے نام لیتا ہے جو آنکھ سے دکھائی ہی نہیں دیتے... اور ایک ایک کو اُس کے نام سے جا لیتا ہے۔ **تو اُسے کس نے سکھایا؟**

اندھیرے، ایک کے اوپر ایک

یا اُن اندھیروں کی مانند جو گہرے سمندر میں ہوں، جنہیں موج ڈھانپے، اُس کے اوپر موج،

اُس کے اوپر بادل — اندھیرے، ایک کے اوپر ایک

سورہ النور — آیت 40



روشنی تہ در تہ نگلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک ہزار میٹر سے نیچے بالکل غائب ہو جائے

آسان لفظوں میں

سمندر کی گہرائیوں میں اندھیرے پر اندھیرا ہے: بادل روکتا ہے، پھر موج روکتی ہے، پھر پانی رنگوں کو ایک ایک کر کے نگل جاتا ہے، یہاں تک کہ کوئی روشنی باقی نہیں رہتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کوئی انسان سانس روک کر چند میٹر سے زیادہ گہرائی میں نہ اُتر سکا تھا۔ سمندر کی گہرائیاں سراسر نامعلوم تھیں۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہاں کا اندھیرا **درجہ بہ درجہ** **تہوں** میں ہے، اور نہ یہ کہ نظر آنے والی موج کے نیچے ایک اور موج ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پانی میں روشنی مرحلہ وار جذب ہوتی ہے: سرخ رنگ تقریباً 15 میٹر پر غائب ہو جاتا ہے، پھر نارنجی، پھر زرد، پھر سبز، اور صرف مدہم نیلا باقی رہتا ہے، وہ بھی تقریباً 200 میٹر پر ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ہزار میٹر سے نیچے **مکمل تاریکی ہے، ایک فوٹون بھی نہیں**۔ سائنس نے **اندرونی موجیں** بھی دریافت کیں، جو مختلف کثافت والی پانی کی تہوں کی سرحدوں پر چلتی ہیں — موجوں کے نیچے موجیں۔

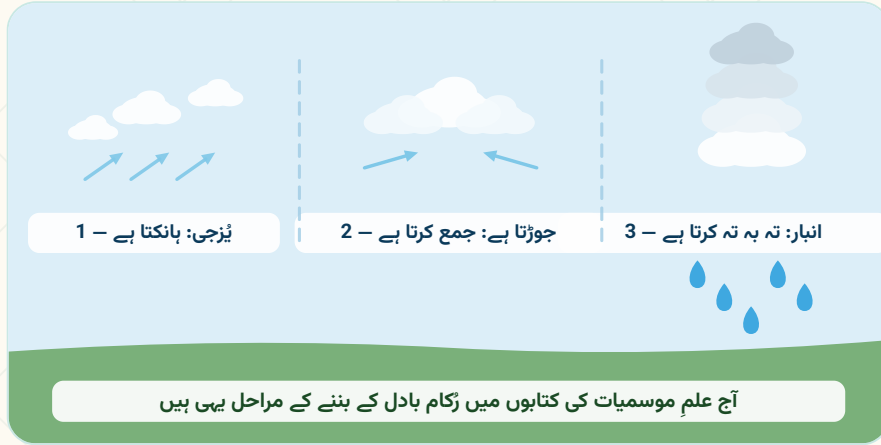
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے تین پردے صحیح ترتیب سے اوپر سے نیچے رکھے: بادل، پھر موج، پھر اُس کے نیچے **ایک اور موج**۔ سمندر کی سطح کے نیچے دوسری موج کا وجود ایسی حقیقت ہے جو بیسویں صدی سے پہلے معلوم نہ تھی۔ پھر جامع وصف پر بات ختم کی: «اندھیرے، ایک کے اوپر ایک» — یعنی **تہ بہ تہ چڑھا ہوا اندھیرا**، ایک اندھیرا نہیں۔ اور یہی پانی میں روشنی کے جذب ہونے کا عین طبیعی بیان ہے۔

بارش بننے کے تین مرحلے

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو ہانکتا ہے، پھر آپس میں جوڑتا ہے، پھر ڈھیر بنا دیتا ہے، تو آپ دیکھتے ہیں کہ بارش اُس کے بیچ سے نکلتی ہے

سورہ النور – آیت 43



بانکتا، پھر جوڑتا، پھر عمودی ڈھیر لگتا... اور پھر بارش اُترتی ہے

آسان لفظوں میں

بارش اچانک نہیں اُترتی۔ اُس کے تین مرحلے ترتیب سے ہیں: ہوا بادل کے چھوٹے ٹکڑوں کو **ہانکتی** ہے، پھر انہیں آپس میں **جوڑتی** ہے، پھر انہیں پہاڑ کی طرح ایک دوسرے پر **ڈھیر کرتی** ہے - تب بارش ہوتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بارش ایک ہی واقعہ تھا: بادل، پھر پانی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ بادل کے بننے کے مرتب مرحلے ہیں، اور نہ یہ کہ برسنے والا بادل نہ برسنے والے بادل سے ساخت میں مختلف ہوتا ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

علم موسمیات میں **زکام (Cumulonimbus)** بادل کی پیدائش کے بارے میں یہی پڑھایا جاتا ہے: ہوائی دھارے چھوٹے بادل خلیوں کو ہانک لاتے ہیں، پھر یہ خلیے آپس میں مل جاتے ہیں، پھر یہ تودہ ڈھیر بنتی تھوں میں عمودی بڑھتا ہے یہاں تک کہ 15 کلومیٹر بلند ہو جائے۔ **اسی مرحلے پر** قطرے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ گر سکیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تین پے در پے افعال، «ثُمَّ» کے ساتھ جو ترتیب اور وقفے پر دلالت کرتا ہے: «بانکتا ہے» (نرمی سے چلاتا ہے) ← «آپس میں جوڑتا ہے» (ٹکڑوں کو ملاتا ہے) ← «ڈھیر بنا دیتا ہے» (عمودی طور پر تہ نہ کرتا ہے)۔ یہ ایسی ترتیب ہے جو نہ الٹی جا سکتی ہے نہ مختصر، اور یہی عین سائنسی ترتیب ہے۔ پھر آخری باریکی آئی: بارش «اُس کے بیچ سے» نکلتی ہے - یعنی تودے کے اندر کے شگافوں اور موڑوں سے، اُس کے نیچے سے نہیں۔ اور ریڈار کی تصویریں یہی دکھاتی ہیں۔

» کھجور کی پرانی شاخ کی طرح... چاند کے بارے میں کہی گئی سب سے باریک تشبیہ

اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کیں، یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کی طرح لوٹ آتا ہے۔

سورہ یسین - آیت 39



دو لفظوں میں چار صفتیں: خمیدہ، باریک، زرد، اور دورے کے آخر میں

آسان لفظوں میں

عرجون وہ ٹہنی ہے جس سے کھجور کے خوشے لٹکتے ہیں۔ جب وہ پرانی ہو جائے تو **سوکھ جاتی ہے، باریک ہو جاتی ہے، جھک جاتی ہے اور زرد پڑ جاتی ہے**۔ اور قرآن نے مہینے کے آخر کے چاند کو اسی سے تشبیہ دی - اور یہ بالکل وہی وقت ہے جب وہ ایک باریک، خمیدہ، پھیکا دھاگا بن جاتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

چاند کی منزلیں ہر کوئی دیکھتا ہے، سو بات یہ نہیں کہ انہیں معلوم تھا چاند گھٹتا ہے۔ بات **وصف کی باریکی اور مشتبہ بہ کے انتخاب** کی ہے۔ عربوں نے اپنے شعر میں بلال کو بہت سی چیزوں سے تشبیہ دی - درانتی سے، کشتی سے، ناخن کی کترن سے - اور ان میں سے ہر ایک صرف ایک صفت پکڑتی ہے: **خمیدگی**۔ نہ رنگ پکڑتی ہے، نہ خشکی، نہ دورے میں اُس منزل کی جگہ۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قمری مہینہ **29.5 دن** کا ہے، اور چاند اُسے گنی ہوئی منزلوں میں طے کرتا ہے جن سے کبھی نہیں ہٹتا؛ اور ہر رات اُس کی شکل **اُس کے مقام** کی نشانی ہے، خود اُس کی کسی چیز کی نہیں۔ اور مہینے کے آخر میں اُس کا روشن حصہ گھٹ کر **1% سے بھی کم** رہ جاتا ہے، سو وہ نہایت باریک کمان بن جاتا ہے جس کے دونوں سرے پتلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پھر ایک صفت جس پر رصد کرنے والے کے سوا کسی کی نظر نہیں جاتی: مہینے کے آخر کا بلال **صرف مشرقی افق کے قریب، طلوع فجر سے ذرا پہلے دکھائی دیتا ہے** - آسمان کے بیچوں بیچ کبھی نہیں۔ اور افق کے قریب سے آنے والی روشنی ہوا کی ایک موٹی تہ سے گزرتی ہے جو نیلے کو روک لیتی ہے اور زرد اور سرخ کو گزار دیتی ہے - **سو وہ پھیکا زرد دکھائی دیتا ہے**۔ اور یہ بیچیں سوکھے عرجون کا رنگ ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تشبیہ میں جو قیدیں رکھی گئی ہیں انہیں جمع کیجیے: **خمیدہ، اور باریک، جس کے دونوں سرے پتلے ہوتے جائیں، اور پھیکا زرد، اور دورے کے آخر میں، اُس کے شروع میں نہیں**۔ دو لفظوں میں چار قیدیں، اور چاروں نشانے پر۔

اور چوتھی قید سب سے باریک ہے۔ قرآن نے «بلال» نہیں کہا - جو مہینے کے آغاز کا رائج نام ہے - بلکہ کہا «لوٹ آیا»، یعنی اُس حال کی طرف پلٹا جس پر وہ پہلے تھا؛ اور مشتبہ بہ کو «پُرانا» کہا۔ سو پرانا پن پرانے پن سے ملا، اور لوٹنا دورے سے۔ اسی لیے مفسرین نے، رصد کے بارے میں کچھ معلوم ہونے سے پہلے، کہا: یہ مہینے کے آخر کا چاند ہے، **اُس کے چھپ جانے سے ذرا پہلے**۔

پھر یہ کہ مشتبہ بہ کسی سے دور نہ تھا: **مدینے کے ہر گھر میں عرجون موجود تھا**۔ سو یہ تشبیہ جزیرہ عرب کی ہر آنکھ کے سامنے کھلی پڑی تھی، اور اگر ایک صفت میں بھی چوک جاتی تو مخالفوں کے شاعر اُسی دن اُسے اُچک لیتے - وہی لوگ جنہوں نے اِس سے ہلکی باتوں پر طعن کیا۔ اُن میں سے کسی ایک سے بھی اِس حرف پر کوئی اعتراض نقل نہیں ہوا۔

اور یہاں ایک حد پر رک جائیے: ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ آیت منزلوں کا سبب سکھاتی ہے؛ انکسائورس مسیح سے چار صدیاں پہلے طے کر چکا تھا کہ چاند سورج کی روشنی لوٹاتا ہے۔ ہم جو کہتے ہیں وہ تنگ تر اور مضبوط تر ہے: یہ کہ **دو لفظوں کے ایک وصف نے چار الگ الگ طبیعی صفتیں ایک جگہ جمع کر دیں** - شکل، رنگ، باریکی، اور دورے میں مقام - اور چاروں پر ٹھیک بیٹھا۔ اور یہ کام قسمت سے نہیں ہوتا۔

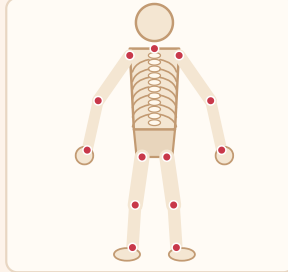
ماخذ تفسیر الطبری - سورق ہیں، ۳۳: تفسیر ابن کثیر - سورق ہیں، ۳۳: Anaxagoras - Stanford Encyclopedia of Philosophy - Botanical Description of the Date Palm - FAQ - NASA Science - Moon Phases

تین سو ساٹھ جوڑ... تشریح سے پہلے گئے گئے

بنی آدم میں سے ہر انسان تین سو ساٹھ جوڑوں پر پیدا کیا گیا ہے

مسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا - صحیح - اور تیریدہ سے اس کا ایک صحیح شاہد بھی ہے

ہر وہ جگہ جہاں دو ہڈیاں ملتی ہیں... کئی ہونی اور نام والی



147	ریڑھ کی ہڈی
24	پسلیوں کا پنجرہ
86	دونوں بالائی اعضا
88	دونوں زریں اعضا
15	پیڑو
360	جوڑ

ایک صریح عدد جو تاویل کا محتمل نہیں - پہلے باریک تشریحی اطلس سے نو صدیاں پہلے کہا گیا

آسان لفظوں میں

آپ کے بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں - یہ بنیادی عدد ہے، اور ایک انسان سے دوسرے تک تھوڑا سا بڑھتا گھٹتا ہے۔ نبی ﷺ نے یہ چودہ صدیاں پہلے فرمایا، اور ان میں سے ہر جوڑ کے ساتھ ایک صدقہ لگا دیا جو ہر روز ادا کیا جائے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرہ عرب میں نہ تشریح تھی نہ طب کے مدرسے، اور انسان کی تشریح بیشتر قدیم تہذیبوں میں حرام تھی، یہاں تک کہ جالینوس نے اپنی ساری تشریح بندروں اور خنزیروں پر کھڑی کی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بدن کے جوڑ ایک ایک کر کے گنے گئے - ہر وہ مقام جہاں دو ہڈیاں ملتی ہیں، خواہ وہ حرکت کرتا ہو یا ٹھہرا ہوا ہو - ڈاکٹر حامد احمد حامد کی تفصیل کے مطابق: ریڑھ کی ہڈی 147، پسلیوں کا پنجرہ 24، دونوں بالائی اعضا 86، دونوں زریں اعضا 88، اور پیڑو 15۔ مجموعہ: تین سو ساٹھ۔ اور گنتی دو چیزوں کے تابع ہے: تعریف، اور بدن۔ جس نے صرف حرکت کرنے والے گنے وہ کم رہ گیا۔ پھر خود بدن بھی تھوڑا بہت مختلف ہوتے ہیں: زائد ہڈیاں تقریباً 26% لوگوں میں ہوتی ہیں، انتقالی مہرہ 15% میں، اور تلوں جیسی ہڈیاں 8% میں۔ سو تین سو ساٹھ ایک صحیح سالم بدن کا بنیادی عدد ہے، ہر انسان میں ایک جامد گنتی نہیں۔ اور پہلا باریک تشریحی اطلس 1543ء ہی میں ویسالیئس کے ہاتھوں سامنے آیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ یہ کس قسم کی خبر ہے: نہ کوئی ایسا وصف جو تاویل کا محتمل ہو، نہ کوئی تشبیہ - بلکہ ایک عدد؛ یا تو ٹھیک بیٹھے گا یا گر جائے گا۔ اگر سلامتی مقصود ہوتی تو فرما دیتے «بہت سے جوڑ»۔ مگر فرمایا: تین سو ساٹھ، ایسے بدن کے بارے میں جو کبھی کھولا نہ گیا تھا، اور ایسے جزیرے میں جہاں نہ کوئی نشتر تھا نہ طب کا کوئی مدرسہ۔

اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ عدد اپنے آپ کے لیے ذکر ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ایک عمل کے سیاق میں آیا: ان میں سے ہر جوڑ پر ہر روز ایک صدقہ ہے۔ سو یہ عدد حکم کا ستون ہے، کلام کی زینت نہیں؛ اور اگر یہ غلط ہوتا تو حکم بھی اس کے ساتھ گر جاتا۔

اور کہا جا سکتا ہے: شاید مراد انگلیوں کی ہڈیاں ہوں - کہ لغت میں «سَلَامَی» کی اصل یہی ہے۔ خود حدیث اس بات کو کاٹ دیتی ہے: آپ ﷺ نے فرمایا «تین سو ساٹھ مَفْصِل پر»، پھر اُسی جملے میں لوٹ کر اسی کو «سَلَامَی» کا نام دیا۔ ایک ہی متن میں ایک ہی معدود کے لیے دو لفظ - سو حدیث ہی نے سَلَامَی کی تفسیر جوڑوں سے کی ہے۔ اور «مَفْصِل» دو ہڈیوں کے ملنے کا مقام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں؛ اسی لیے صحیح مسلم کے تراجم اسے joints نقل کرتے ہیں - بدن کے جوڑ، نہ کہ انگلیوں کی ہڈیاں۔

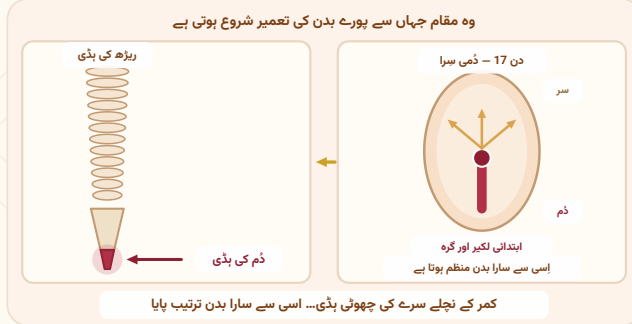
اور دوسری بات یہ کہی جاتی ہے: شاید یہ آپ تک چین کی طب سے پہنچا ہو۔ ہم اسے جوں کا توں کہتے ہیں: ہاں، یہ عدد چین کی قدیم کتابوں میں موجود ہے - «لینگ شُو» کہتی ہے: «سال میں تین سو پینسٹھ دن ہیں، اور بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں»۔ اور خود یہی کتاب بتاتی ہے کہ عدد آیا کہاں سے: تقویم سے، بدن سے نہیں۔ اور سوال باقی رہتا ہے: یہ بات جزیرہ عرب کے صحرا میں ایک اُمّی شخص تک پہنچے تو کیسے؟ اس کی کوئی راہ ہی نہیں - اور دونوں کے درمیان تین رکاوٹیں حائل ہیں:

1 - کوئی راستہ نہیں۔ پہلا اسلامی سفارتی وفد چین 651ء میں پہنچا - آپ ﷺ کی وفات کے اُنیس برس بعد۔
2 - اور کوئی ترجمہ نہیں۔ چینی طب کی پہلی کتاب جو کسی بھی زبان میں باہر آئی وہ «تنکسوق نامہ» ہے، 1313ء میں - حدیث کے سات صدیاں بعد۔
3 - اور خود کتاب گم تھی۔ «لینگ شُو» خود چین ہی سے گم ہو گئی تھی، یہاں تک کہ سونگ دربار نے 1091ء میں کوریا سے اس کی درخواست کی اور 1093ء میں اسے پایا - یعنی حدیث کے ساڑھے چار صدیاں بعد۔

ایک اُمّی شخص جس نے کبھی کوئی بدن نہیں کھولا، اپنی امت کو ایک تشریحی عدد دیتا ہے جس پر ایک عبادت کھڑی کی جاتی ہے... پھر جدید تشریح نو صدیاں بعد اسے گن کر وہی پاتی ہے۔ تو اسے یہ گن کر کس نے دیا؟

ابنِ آدم کا ہر حصہ مٹی کہا جاتی ہے سوائے عَجَبُ الدَّنب کے؛ اسی سے وہ پیدا کیا گیا اور اسی میں وہ دوبارہ جوڑا جائے گا

بخاری اور مسلم نے روایت کیا - متفق علیہ



ابتدائی لکیر جنین کے دُمی سرے پر نمودار ہوتی ہے، اور اسی سے سارے محور اور ساری تہیں بنتی ہیں

آسان لفظوں میں

عَجَبُ الدَّنب ریڑھ کی ہڈی کے بالکل نچلے سرے کی چھوٹی ہڈی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ انسان اسی سے پیدا کیا گیا۔ اور آج علم جنین کہتا ہے: پورے بدن کی تعمیر ایک ایسی لکیر سے شروع ہوتی ہے جو جنین کے دُمی سرے پر نمودار ہوتی ہے، اور اس کے سرے پر ایک گرہ ہے جسے «منظم» کہتے ہیں - اسی سے تینوں تہیں اور بدن کے سارے محور ترتیب پاتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جنین کے بارے میں اس کے پہلے مرحلے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا؛ وہ دو ملی میٹر سے بھی کم ہوتا ہے، کوئی آنکھ اسے پکڑ نہیں سکتی۔ ربی عُصَص کی ہڈی، تو اسے ایک بے کار بچی ہوئی چیز سمجھا جاتا تھا - ایک سکڑی ہوئی دُم؛ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اہل علم نے اسے «اثری اعضا» کی اُس فہرست میں شمار کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ سو اسی مقام کو تخلیق کی اصل ٹھہرانا خود ہدایت کے خلاف ایک بات ہے: عقل سر سے شروع کرتی ہے یا دل سے، کمر کے نچلے سرے سے نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سترہویں دن جنینی قرص میں ایک لکیر نمودار ہوتی ہے جسے ابتدائی لکیر کہتے ہیں، اور اس کا مقام جنین کا دُمی سرا ہے۔ اور اس کے سرے پر ابتدائی گرہ ہے، وہی جسے علم جنین میں «منظم» کہا جاتا ہے: یہ دونوں پہلوؤں کے درمیان تناظر قائم کرتی ہے، تہ بندی کا مقام متعین کرتی ہے، تینوں جرثومی تہیں اسی سے شروع ہوتی ہیں، اور بدن کے محور اسی سے کھینچے جاتے ہیں: سر دُم سے، اور دایاں بائیں سے۔ اور شپیمان اور مانگولڈ نے 1924ء میں ثابت کیا کہ اکیلی ثقبِ ارومی کی پشتی لب - جو سلامینڈر کے جنینوں میں اسی گرہ کی ہم منصب ہے - کسی دوسرے جنین میں منتقل کر دی جائے تو وہ میزبان ہی کے خلیوں سے ایک دوسرا جنینی محور بنوا دیتی ہے، اپنی عصبی نالی، اپنے پشتی رستے اور اپنے قطعوں سمیت - اور شپیمان کو اس پر 1935ء میں نوبیل ملا۔ پھر یہ لکیر سمٹ جاتی ہے اور اس کا باقی حصہ بیسویں دن دُم کی کونپل بن جاتا ہے۔ اور اس کا ایک معروف طبی تعلق باقی رہتا ہے: عُصَصی مسخی رسولی کو ابتدائی لکیر کے بقایا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اور اس کی جراحی میں صرف رسولی نکالنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا - بلکہ عُصَص بھی اس کے ساتھ نکال دیا جاتا ہے، کیونکہ اسے چھوڑ دینا ہی رسولی کو لوٹا لاتا ہے۔

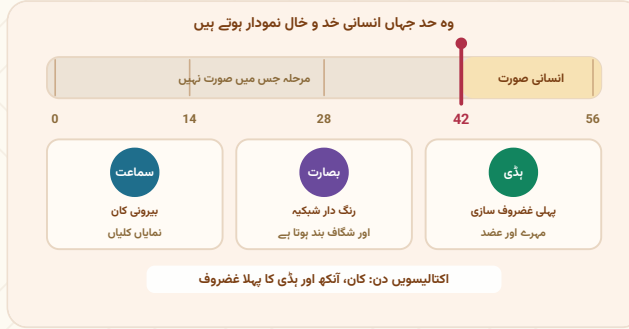
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

صرف حرف جر پر نظر ڈالیں۔ نہ فرمایا «اُس میں پیدا کیا گیا» اور نہ «سب سے پہلے یہی پیدا کیا گیا»، بلکہ «اسی سے پیدا کیا گیا» - سو اس مقام کو ایسا سرچشمہ ٹھہرا دیا جس سے عمارت نکلتی ہے۔ اور یہ بعینہ منظم کی تعریف ہے: یہ پہلا بننے والا عضو نہیں، بلکہ وہ مقام ہے جس سے باقی اعضا ترتیب پاتے ہیں۔ پھر اُس مقام کو دیکھیے جو چنا گیا: کمر کا نچلا سرا۔ ساتویں صدی کے مشاہدے میں کوئی چیز اسے تخلیق کی اصل کہنے پر آمادہ نہیں کرتی، بلکہ ہر چیز اس سے ہٹاتی ہے۔ اور اسے کسی کے دیکھنے کی کوئی صورت بھی نہ تھی: سترہویں دن کا جنین اتنا چھوٹا ہے کہ ننگی آنکھ اسے پکڑ نہیں سکتی۔ اور یہاں ہم ایک ایسی حد پر رکتے ہیں جس کا کہنا ضروری ہے۔ حدیث کا دوسرا حصہ - «اور اسی میں وہ دوبارہ جوڑا جائے گا» - بعث کی خبر ہے، اور یہ ایک غیبی معاملہ ہے جس تک کوئی تجربہ نہیں پہنچتا، اور ہم یہاں اس پر کچھ نہیں بناتے۔ اور جو یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ سائنس نے «ثابت کر دیا کہ عُصَص فنا نہیں ہوتا»، تو ہمیں اس کی تائید میں کوئی شائع شدہ محکم تحقیق معلوم نہیں - اور جس بات کی کوئی دلیل نہ ہو اسے چھوڑ دینا دلیل کو اس سے بڑھانے کے مقابلے میں زیادہ نفع بخش ہے۔ سو سارا وزن پہلے حصے میں ہے: بدن کے ایک مقام کے بارے میں ایک مختصر جملہ، جانچا جا سکے والا، جو خوردبین سے ایک ہزار برس پہلے کہا گیا... اور پورا اترا۔ تو اسے اس کا پتا کس نے دیا؟

بیالیس راتیں... پھر صورت ظاہر ہوتی ہے

جب نطفے پر بیالیس راتیں گزر جاتی ہیں تو اللہ اُس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے جو اُسے صورت دیتا ہے، اور اُس کی سماعت اور بصارت، اُس کی کھال، گوشت اور ہڈیاں پیدا کرتا ہے

مسلم کی روایت - صحیح



ایک انوکھا عدد، جو صرف اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہی مراد ہے - چالیس نہیں، بیالیس

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے فرمایا کہ نطفے پر جب **بیالیس راتیں** گزر جائیں تو اُسے صورت دی جاتی ہے، اور اُس میں سماعت، بصارت، کھال، گوشت اور ہڈی پیدا کی جاتی ہے۔ اور علم جنین آج ٹھیک اسی دن پر ایک **حد** رکھتا ہے: اس سے پہلے صورت میں کوئی چیز انسانی جنین کو دوسروں سے الگ نہیں کرتی، اور اسی پر انسانی نقوش ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کسی کے پاس کوئی راستہ نہ تھا کہ بیالیسویں دن کے جنین کو دیکھ سکے: اُس کی لمبائی تقریباً **بارہ ملی میٹر** ہوتی ہے، اور وہ رحم کے اندر ہے۔ یونانیوں کے ہاں تشکیل کا ایک مشہور وقت مقرر تھا: **ارسطو** نے «تاریخ الحیوان» میں یہ طے کیا کہ نہ جنین **چالیسویں دن** پہچانا جاتا ہے اور مادہ **نوّے ویں دن**، اور اُس سے پہلے وہ «ایک گوشت نما مادہ ہے جس میں اجزا کی کوئی جدائی نہیں»۔ اور یہ وقت اپنے دونوں حصوں میں غلط ہے: تشکیل کے وقت میں نہ وہ مادہ کا کوئی فرق نہیں، اور تناسلی اعضا بارہویں ہفتے سے پہلے پہچانے نہیں جاتے۔ اس کے باوجود ارسطو نے ہزار سال طب اور قانون پر حکومت کی۔ اور جنین کی نشو و نما کا درست زمانی نقشہ بیسیویں صدی سے پہلے وجود میں نہ آیا، جب **کارنیگی مراحل** دنوں میں شمار کی گئی عمروں پر ترتیب دیے گئے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

کارنیگی کے مراحل میں سترہواں مرحلہ **باروری** سے **اکتالیس دن** کی عمر رکھتا ہے، اور اُس میں جنین کی لمبائی 11 تا 14 ملی میٹر ہوتی ہے۔ اور ٹھیک اسی مرحلے میں:

- **کان:** کان کی چھ کلیاں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بیرونی کان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔
- **آنکھ:** شبکیہ کی رنگت صاف ظاہر ہو جاتی ہے، شگاف شبکیہ بند ہوتا ہے، اور عدسے کے ریشے بنتے ہیں۔
- **ہڈی:** مہروں کے جسموں میں اور عضد و کعبہ کی ہڈیوں میں غضروف بننا شروع ہوتا ہے۔ اور ہنسل - پورے بدن کی وہ پہلی ہڈی جو سخت ہوتی ہے - اُس کی استخوان بندی کا مرکز اسی **چھٹے ہفتے** میں ظاہر ہوتا ہے۔

اور **برٹانیکا** اِس مدت کے بیان میں کہتا ہے کہ چوتھے ہفتے میں جنین ایک ممالیہ کے طور پر پہچانا جانے لگتا ہے، پھر: «**دوسرے مہینے کے آخری ہفتوں میں تبدیلیاں اُن سے آگے بڑھتی ہیں جو پرائیمیٹس کو ممتاز کرتی ہیں، اُس حالت کی طرف جس میں وہ پہچانے جانے کے قابل انسان بنے**»۔ اور دوسرے مہینے کے آخری ہفتے بیالیسویں دن سے شروع ہوتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں باریکی **اُس انوکھے عدد** میں ہے۔ اگر کہنے والا کوئی خوشگوار عدد چاہتا تو چالیس کہتا - وہ عدد جو ہر بات میں عربوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا، اور **وہی عدد اُس زمانے کی طب میں تیار پڑا تھا:** ارسطو کے ہاں چالیس دن، اور اُس کے بعد ہزار سال تک طب اور قانون میں۔ سو اگر یہ نقل ہوتی یا رائج بات کی موافقت، تو چالیس ہی آتا۔ مگر اُنہوں نے **بیالیس** کہا؛ ایسا عدد جو صرف اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہی مراد ہے، اور ایسے کلام میں بے سبب نہیں چنا جاتا جو یاد کیا اور آگے پہنچایا جاتا ہے۔ پھر ارسطو نے نہ وہ مادہ میں فرق کیا اور غلطی کی، اور حدیث نے فرق نہ کیا اور ٹھیک کہا۔

پھر دیکھیے کہ اِس دن کے ساتھ کیا باندھا گیا: **صورت گری**۔ نہ زندگی، نہ حرکت، نہ دھڑکن - بلکہ صورت۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے علم جنین اسی حد پر رکھتا ہے: اِس سے پہلے انسانی جنین کی صورت باقی ریڑھ دار جانوروں کے جنین سے الگ نہیں کی جا سکتی، اور اِس کے بعد نقوش ظاہر ہو جاتے ہیں۔

پھر ترتیب دیکھیے: **اُس کی سماعت اور بصارت** - سماعت پہلے۔ اور یہی ترتیب ہے جسے قرآن نے ہر اُس مقام پر نبھایا جہاں اِن دونوں کا ذکر کیا۔ اور اُسی ہفتے میں وہ تینوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جن کا نام حدیث نے لیا: کان بنتا ہے، شبکیہ رنگ پکڑتا ہے، اور پہلی ہڈی اپنا مرکز باندھتی ہے۔ **تین مختلف نظام اپنی حد ایک ساتھ عبور کرتے ہوئے۔**

اور **ایک حد پر ٹھہر جائیے:** فرشتہ جو کرتا ہے وہ غیب ہے، خوردبین سے ناپا نہیں جاتا، اور ہم یہاں اُس پر کچھ بنا نہیں رہے۔ جو ناپا جاتا ہے وہ **وقت** ہے: ایک گنی ہوئی معین رات، ایسے بدن میں جو دکھائی نہ دیتا تھا، خوردبین بننے سے ہزار سال پہلے کہی گئی... اور ٹھیک نکلی۔ **تو اُنہیں اِس کی خبر کس نے دی؟**

آپ میں سے کوئی ٹھہرے پانی میں پیشاب نہ کرے

آپ میں سے کوئی اُس ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے جو بہتا نہیں، پھر اُس میں غسل کرے

بخاری اور مسلم کی روایت — متفق علیہ

بلہارزیا کا چکر — اور اُس کے دونوں سرے ہی ممنوع ہیں

1

مریض ٹھہرے پانی میں پیشاب کرتا ہے — اُس میں انڈے ہیں

2

انڈا صرف میٹھے پانی میں پھوٹتا ہے

3

لاروا اُس گھونگے میں جو صرف ٹھہرے پانی میں رہتا ہے

4

لاروے نکل کر نہالے والے کی جلد چیرتے ہیں

ایک ہی جملے میں چکر کے آغاز اور انجام سے منع کیا

ایسی قید جس کا کوئی مطلب نہ ہوتا اگر ممانعت محض گندگی کی وجہ سے ہوتی: «ٹھہرا ہوا پانی جو بہتا نہیں»

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے دو باتوں سے ایک ساتھ منع فرمایا: یہ کہ آدمی ایسے ٹھہرے پانی میں پیشاب کرے جو بہتا نہیں، اور یہ کہ پھر اُسی میں غسل کرے۔ اور یہی دونوں بلہارزیا کے چکر کے ٹھیک دو سرے ہیں — مصر اور جزیرہ عرب کا سب سے پھیلا ہوا طفیلی کیڑا: اُس کے انڈے پیشاب کے ساتھ نکلتے ہیں، میٹھے ٹھہرے پانی کے سوا نہیں پھوٹتے، اور پھر انسان کے اندر اُس کی کھال سے داخل ہوتے ہیں جب وہ پانی میں اُترتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کوئی نہیں جانتا تھا کہ پیشاب بیماری منتقل کرتا ہے، نہ یہ کہ پانی میں کوئی چیز ہے جو کھال سے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ بلکہ ٹھہرا ہوا تالاب پینے اور نہانے دونوں کا گھاٹ تھا۔ اور اُس کیڑے کو اپنی آنکھ سے دیکھنے والا پہلا شخص جرمن طبیب تیوڈور بلہارٹس تھا، قاہرہ کے قصر العینی اسپتال میں، سن 1851 میں۔ رہا یہ کہ وہ منتقل کیسے ہوتا ہے، تو یہ اُس کے بعد چونسٹھ سال تک نامعلوم رہا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ چکر جیسا کہ عالمی ادارہ صحت بیان کرتا ہے:

- 1 — بیمار شخص اپنے پیشاب سے میٹھا پانی آلودہ کرتا ہے، جس میں طفیلی کے انڈے ہیں۔
- 2 — انڈا میٹھے پانی سے ملے بغیر نہیں پھوٹتا، اور اُس سے تیرتا ہوا لاروا نکلتا ہے۔
- 3 — لاروا میٹھے پانی کے گھونگے میں داخل ہوتا ہے — اور یہ گھونگے ٹھہرے یا سست پانی کے سوا زندہ نہیں رہتے — اور اُس کے اندر ہزاروں گنا بڑھتا ہے۔
- 4 — اُس سے دوسرے لاروے نکلتے ہیں جو پانی میں تیرتے ہیں، پھر اگر کوئی انسان اُس میں اُترے تو وہ چند منٹوں میں اُس کی کھال چیر دیتے ہیں۔ اور لائپر نے سن 1915 میں وہ حصہ ثابت کیا جس کی کسی کو توقع نہ تھی: یہ کہ بیماری منہ کے راستے سرے سے لگتی ہی نہیں، بلکہ کھال چیرنے سے لگتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ یہ ممانعت مرکب آئی، اکہری نہیں۔ یہ نہیں فرمایا: پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا: ٹھہرے پانی میں غسل نہ کیا جائے۔ بلکہ دونوں کاموں کو ایک ہی جملے میں «پھر» کے ساتھ جوڑ دیا: اُس میں پیشاب کرنا، پھر اُسی میں غسل کرنا۔ اور یہی دونوں — حرف بہ حرف — اُس چکر کا دروازہ اور اُس کا نکاس ہیں۔

پھر اُس قید کو دیکھیے: «ٹھہرا ہوا پانی جو بہتا نہیں»۔ ایسی قید جس کا کوئی مطلب نہ ہوتا اگر ممانعت محض گھن کی وجہ سے ہوتی، کہ گندگی بہتے پانی میں بھی گندگی ہے۔ مگر یہ نہایت باریک ہے اگر مراد وہی ہو جو ہم آج جانتے ہیں: بیماری اُٹھانے والا گھونگا بہتے پانی میں زندہ نہیں رہتا۔ اور اگر معاملہ ذوق اور گھن کا ہوتا تو زیادہ مناسب یہ تھا کہ اُس میں سے پینے سے منع کیا جاتا — کہ یہ طبیعت کے زیادہ قریب ہے اور پہلی بات ہے جو ذہن میں آتی ہے۔ مگر ممانعت غسل پر آئی، اور کوئی یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ پینے سے زیادہ خطرناک ہے... یہاں تک کہ لائپر نے 1915 میں ثابت کیا کہ بیماری کھال سے لگتی ہے، منہ سے نہیں۔

ایک ہی جملے میں تین قیدیں — ٹھہراؤ، پیشاب، اور غسل — ان میں سے ہر ایک ایسی بیماری کے چکر کے ایک حقیقی جوڑ کو نشانہ بناتی ہے جس کا پہلا کیڑا بارہ صدیوں کے بعد دیکھا گیا، اور جس کے پھیلنے کا راستہ تیرہ صدیوں کے بعد معلوم ہوا۔ تو انہیں ان تینوں کا پتا کس نے دیا؟

ماخذ: WHO — fact sheet: Schistosomiasis · Leiper (1915) — the Bilharzia Mission in Egypt · Theodor Bilharz — Kasr el-Aini, Cairo, 1851

یہ دوا نہیں، بلکہ بیماری ہے

مسلم کی روایت - صحیح



یہ نہیں فرمایا کہ اُس کا نقصان نفع سے زیادہ ہے - بلکہ دوا ہونے کی نفی کی اور بیماری ہونا ثابت کیا

آسان لفظوں میں

ایک شخص نبی ﷺ کے پاس شراب کے بارے میں پوچھنے آیا، تو آپ نے منع فرمایا۔ اُس شخص نے کہا: «میں تو اسے صرف دوا کے لیے بناتا ہوں»۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «یہ دوا نہیں، بلکہ بیماری ہے»۔ اور اُس دن شراب بلا شرکتِ غیرہ ساری دنیا کی دوا تھی۔ اور آج عالمی ادارہ صحت اُسے پہلے درجے کی سرطان پیدا کرنے والی چیز شمار کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ اُس کی کوئی مقدار سرے سے محفوظ نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم طب میں شراب کوئی ایسا مشروب نہ تھی جسے ہلکا لیا جاتا - بلکہ وہ علاج کے ستونوں میں سے ایک ستون تھی۔ تاریخ کا قدیم ترین دستور ادویہ، سومر سے تقریباً 2100 قبل مسیح، شراب کو دوا لکھتا ہے۔ اور مصری ایبرس پیپرس، تقریباً 1550 قبل مسیح، اُسے جڑی بوٹیوں کے ساتھ ملاتا ہے، جراثیم کش بھی اور دوا کا حامل بھی۔ اور بقراط نے اُسے تقریباً پر بیماری کے پریمی نظام میں داخل کیا اور زخموں کا مطہر بنایا۔ اور جالینوس نے کہا کہ وہ بدن کو صاف کرتی ہے اور اُس کے اخلاط میں توازن لاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ طب کی کتابوں میں تقریباً پچیس صدیوں تک چلتا رہا، انیسویں صدی تک۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

تبدیلی کا آغاز 1850 کے بعد تجرباتی طب کے ساتھ ہوا۔ سن 1916 میں وہسکی اور برانڈی امریکی دستور ادویہ سے نکال دی گئیں۔ اور 1917 میں امریکی طبی انجمن نے اعلان کیا کہ الکحل بطور مقوی یا محرک «کوئی علمی قدر نہیں رکھتی»۔

پھر آخری فیصلہ آیا: سرطان کی تحقیق کا بین الاقوامی ادارہ الکحل کو پہلے درجے میں رکھتا ہے - سرطان پیدا کرنے والی چیزوں کا سب سے اونچا درجہ، ایسبیسٹس، تابکاری اور تمباکو کے ساتھ۔ اور جنوری 2023 میں عالمی ادارہ صحت نے شائع کیا کہ الکحل کی کوئی مقدار صحت کے لیے محفوظ نہیں۔ اور کم از کم سات قسم کے سرطان اُس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، اور ہر سال تقریباً 7 لاکھ 40 ہزار نئے مریض۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس بات کے موقع پر ٹھہریے۔ وہ شخص لذت کے لیے پینے کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا، نہ خواہش کا عذر پیش کر رہا تھا - اُس نے کہا: «میں تو اسے صرف دوا کے لیے بناتا ہوں»۔ یعنی وہ اُس دن ساری دنیا میں سب سے مضبوط دلیل لے کر آیا تھا۔ اور اگر یہ ممانعت محض تعبدی ہوتی تو جواب یہ ہوتا: «اسے نہ پیجیے، دوا کے لیے بھی نہیں»۔ مگر جواب اُس کی حقیقت کی خبر بن کر آیا: یہ دوا ہے ہی نہیں - بلکہ یہی بیماری ہے۔

اور یہ ایسا جملہ ہے جو اُس دن روئے زمین پر موجود ہر طب کے اجماع کے خلاف ہے: یونانی، رومی، فارسی، ہندی اور مصری۔ ایک مکتب بھی اس سے متفق نہیں - سو کوئی ایسا تھا ہی نہیں جس سے یہ بات لی جا سکتی، کیونکہ یہ ایسی بات تھی جس کا کوئی کہنے والا نہ تھا۔

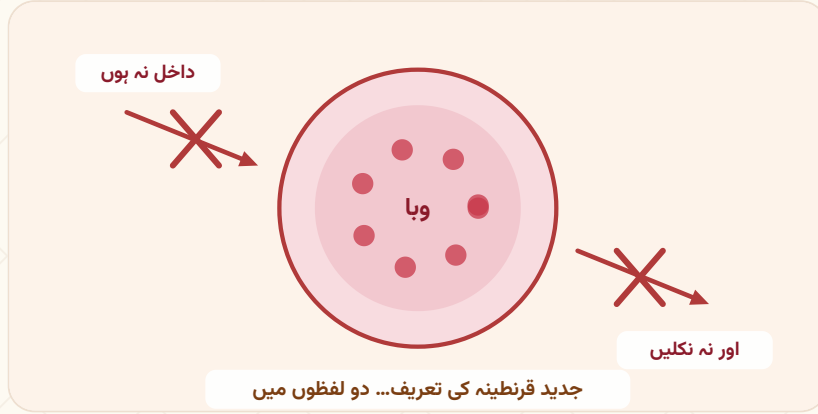
پھر وقت گزرا۔ شراب 1916 میں دستاویز ادویہ سے نکل گئی، اور 2023 میں پہلے درجے کی سرطان پیدا کرنے والی چیز بن گئی جس کی کوئی مقدار محفوظ نہیں۔ یعنی طب کو تیرہ صدیاں درکار ہوئیں تاکہ وہاں پہنچے جو پانچ لفظوں کے ایک جملے نے کہہ دیا تھا۔

اور اس اندازِ بیان کی باریکی دیکھیے: یہ نہیں فرمایا کہ «اُس کا نقصان اُس کے نفع سے زیادہ ہے» - جو بات محتاط آدمی کہتا ہے اور اس میں محفوظ رہتا ہے - بلکہ اُس سے دوا ہونے کی صاف نفی کی اور بیماری ہونا صاف ثابت کیا۔ اور یہی وہ بات ہے جہاں ادارہ تیرہ صدیوں بعد پہنچا: کوئی مقدار محفوظ نہیں۔ تو انہیں کس نے بتایا؟

قرنطینہ... طب سے ایک ہزار برس پہلے

جب کسی سرزمین میں طاعون کی خبر سنیں تو وہاں نہ جائیں، اور جب وہ اُس سرزمین میں پھوٹ پڑے جہاں آپ ہوں تو اس سے بھاگتے ہوئے نہ نکلیں

بخاری اور مسلم نے روایت کیا — متفق علیہ



ایک عالمی صحتی اصول جو ساتویں صدی عیسوی میں وضع کیا گیا

آسان لفظوں میں

اگر کسی ملک میں وبا پھوٹ پڑے: اگر آپ باہر ہیں تو اس میں داخل نہ ہوں، اور اگر آپ اندر ہیں تو اس سے باہر نہ نکلیں۔ اور یہ بعینہ قرنطینہ کی وہی تعریف ہے جو ساری دنیا نے کورونا کی وبا میں برتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

وباؤں کو غضب، یا بدروحیں، یا بگڑی ہوئی ہوا سمجھا جاتا تھا۔ اور ان کے پھوٹ پڑنے پر فطری ردعمل اجتماعی فرار تھا — اور یہی سب سے بدترین کام ہے، کیونکہ یہ وبا کو ہر جگہ لے جاتا ہے۔ اور جراثیم معلوم نہ تھے، اور نہ یہ معلوم تھا کہ بیماری میل جول سے منتقل ہوتی ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جرثومی نظریہ انیسویں صدی ہی میں پاستور اور کوخ کے ہاتھوں قائم ہوا۔ اور یورپ میں پہلا منظم قرنطینہ راگوزا (ڈوبرونک) میں 1377ء میں ہوا، پھر وینس نے پہلا مستقل قرنطینہ گھر 1423ء میں بنایا — یعنی اس حدیث کے سات صدیاں بعد۔ اور حدیث میں مذکور اصول ایک دو طرفہ قرنطینہ ہے: داخلے کی ممانعت اور نکلنے کی ممانعت — اور بعینہ یہی وہ ہے جو عالمی ادارہ صحت کے بین الاقوامی صحتی ضوابط میں درج ہے، اور جو 2020ء میں ساری دنیا میں برتا گیا۔

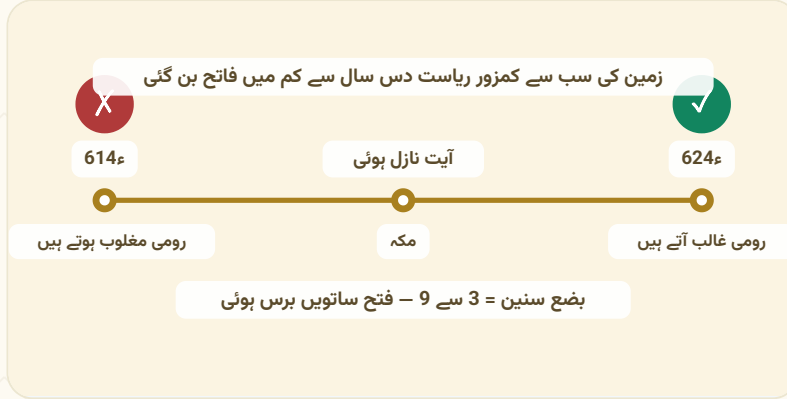
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حدیث کا دوسرا نصف ہی سب سے مشکل اور سب سے باریک ہے۔ وبا زدہ سرزمین میں داخلے کی ممانعت تو ایسی بات ہے جس تک محض احتیاط سے عقل پہنچ سکتی ہے۔ رہی اس سے نکلنے کی ممانعت، تو یہ خود بقا کی جیل کے خلاف ہے، اور تب ہی ٹھیک بیٹھتی ہے جب یہ معلوم ہو کہ نکلنے والا بیماری اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے اور اسے خبر تک نہ ہو — یعنی «وبا کے خاموش حامل» کا تصور۔ اور یہ ایسا تصور ہے جو بیسویں صدی ہی میں معلوم ہوا۔ اور اسے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے طاعون عَمَواس میں عملاً برتا اور لشکر کو شام سے واپس لے آئے، پھر جب ان پر عتاب کیا گیا تو فرمایا: «بم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں»۔

روم مغلوب ہو گیا... اور وہ ضرور غالب آئے گا

الم ۞ روم مغلوب ہو گیا ۞ زمین کے سب سے نشیبی حصے میں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد ضرور غالب آئیں گے ۞ چند برسوں میں

سورہ روم – آیات 1-4



ایک خبر جو مکہ میں ایسی جنگ پر اُتری جو ہزاروں میل دور لڑی جا رہی تھی

آسان لفظوں میں

روم ایک جنگ اتنی بُری طرح ہارا کہ لوگوں نے سمجھ لیا وہ ختم ہو گیا۔ پھر ایک آیت اُتری جو کہتی ہے: **روم چند برسوں میں غالب آ جائے گا**۔ اور یہ سات برس بعد واقع ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سن 614 عیسوی میں فارسیوں نے رومیوں کو بُری طرح کچل دیا: شام اور بیت المقدس لے لیا، پھر 618 اور 621 کے درمیان مصر، اور مقدس صلیب اُٹھا لے گئے۔ اور رومی سلطنت مکمل تباہی کے کنارے تھی — خالی خزانہ، ٹوٹی ہوئی فوج اور اندرونی بغاوت۔ اور زمین پر کوئی اُس کی واپسی پر شرط نہ لگاتا تھا۔ اور مکہ کے مشرکوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اِس آیت کے جھوٹا ہونے پر شرط لگائی — اور شرط لگانا اُس کی حرمت سے پہلے جائز تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سن 622 میں ہرقل جوابی مہم پر نکلا اور اُسی سال خزاں میں شہر براز کو شکست دی، پھر کسریٰ کے لشکر کو **گنزک میں 624** کو توڑا — اور یہی بدر کا سال ہے، جیسا کہ اگلی آیت نے کہا: «اور اُس دن مومن خوش ہوں گے»۔ اور **دسمبر 627** میں اُس نے موصل کے قریب نینوی کی جنگ میں فارسی لشکر کو کچل دیا، پھر 628 میں کسریٰ کو گرا دیا اور صلیب واپس لایا۔ اور یہ بازنطینی، فارسی اور سریانی مصادر میں ثابت ہے، اسلامی مصادر سے آزادانہ طور پر۔

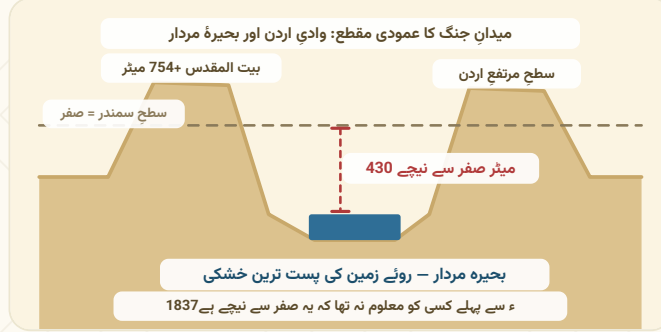
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ نہ کوئی حکمت ہے نہ کوئی وصف — یہ ایک ایسی پیشین گوئی ہے جس کا موضوع بھی متعین ہے اور مدت بھی، اور یہ اُس فریق کے حق میں اُس وقت آئی جو اُس کے لیے بدترین ممکن لمحہ تھا۔ اور عربی میں «بضع» تین اور نو کے درمیان محدود ہے — یعنی ایک بند مدت جسے جھٹلایا جا سکتا تھا۔ اور اگر دس برس بغیر فتح کے گزر جاتے تو یہ پوری دعوت اپنے مخالفوں کے سامنے گر جاتی۔ اور اِس سے بھی باریک بات: «زمین کے سب سے نشیبی حصے میں» — اور یہ جنگ بحیرہ مردار کے علاقے میں ہوئی، جو **کرہ ارض کی خشکی کا سب سے نیچا مقام** ہے (سطح سمندر سے 430 میٹر نیچے) — ایک جغرافیائی حقیقت جو انیسویں صدی سے پہلے ناپی ہی نہیں گئی تھی۔

«سب سے نیچی زمین میں»... کرۂ ارض کی پست ترین خشکی

الم رومی مغلوب ہو گئے سب سے نیچی زمین میں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے

سورہ روم - آیات 1-3



کرۂ ارض پر وہ واحد زمین جس پر یہ لفظ دونوں معنوں میں صادق آتا ہے

آسان لفظوں میں

آیت نے صرف اتنا نہیں کہا کہ «رومی مغلوب ہو گئے» - بلکہ جگہ بھی متعین کی: «سب سے نیچی زمین میں». اور عربی میں لفظ «ادنیٰ» دو معنی رکھتا ہے: سب سے قریب، اور سب سے نیچا. اور لڑائی ایک ایسے علاقے میں ہوئی جو واقعی پورے روئے زمین کی سب سے نیچی خشکی ہے - بحیرہ مردار کے گرد وادی اردن.

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ساتویں صدی میں کسی کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ کوئی جگہ سطحِ سمندر سے کتنی بلند ہے۔ آنکھ یہ نہیں دکھاتی، اور جو مسافر اس وادی میں اترتا ہے وہ ایک نیچی وادی دیکھتا ہے، ویسی ہی جیسی وہ یمن، عمان اور فارس میں دیکھ چکا ہے۔ اور سطحِ سمندر سے بلندی کی پیمائش ایک ایسا علم تھا جو ابھی پیدا ہی نہ ہوا تھا: اس کے لیے بیرومیٹر چاہیے (جو 1643ء سے پہلے ایجاد ہی نہیں ہوا) یا ساحل سے چلتی ہوئی لمبی مثلثی پیمائش۔ اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی خشکی سمندر کی سطح سے نیچے ہو سکتی ہے اور پانی اسے ڈبوتا نہ ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مارچ 1837ء میں دو سیاحوں مور اور بیکی نے پانی کے نقطۂ جوش کے طریقے سے اس علاقے کی پیمائش کی کوشش کی، تو ایسا نتیجہ نکلا جس نے جغرافیہ دانوں کو چونکا دیا: یہ جگہ سمندر کی سطح سے نیچے ہے۔ پھر لیفٹیننٹ سیمنڈز نے 1841ء میں اسے مثلثی پیمائش سے ناپا، پھر لنچ کی امریکی مہم نے 1848ء میں۔ اور آج کا عدد: بحیرہ مردار کی سطح تقریباً 430 میٹر سطحِ سمندر سے نیچے ہے، اور یہ پوری سطح زمین کا پست ترین کھلا مقام ہے - کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرتا۔ اور یہ صدی بحیرہ مردار کا حصہ ہے، جو عظیم افریقی شکاف کے اندر پھیلا ہوا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ آیت جگہ کا ذکر کرنے پر مجبور ہی نہ تھی۔ فتح کی پیش گوئی اس کے بغیر بھی پوری ہو جاتی ہے۔ سو ایک زائد جغرافیائی قید کا داخل کرنا جھٹلائے جانے کے مواقع میں اضافہ ہے، تصدیق کے مواقع میں نہیں - اور جو کوئی متن گھڑتا ہے وہ اس کے بالکل الٹ کرتا ہے۔ پھر یہ کہ لفظ کا پہلا معنی - «جزیرۂ عرب سے سب سے قریب» - درست بھی ہے اور تنہا کافی بھی، اور متن میں کوئی چیز دوسرے معنی پر موقوف نہیں۔ لیکن دوسرا معنی بھی درست ہے، اور ایسے انداز میں کہ کرۂ ارض کی کوئی اور جگہ اس میں شریک نہیں۔ دونوں دلائلوں کا ایک ہی مقام پر جمع ہو جانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پہلے سے حساب لگایا جاتا ہو۔

اور یہاں ایک حد بیان کر دینی چاہیے: پہلے مفسرین نے اسے قرب پر محمول کیا، پستی پر نہیں، کیونکہ پستی ان کے علم میں تھی ہی نہیں - اور یہی خود گواہی ہے: معنی متن میں اس سے پہلے موجود تھا کہ لوگوں کے پاس اسے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا۔ اور خود پیش گوئی - چند برسوں میں فتح - اپنے پیروں پر الگ قائم رہتی ہے، اور وہ اس کتاب کے ایک دوسرے صفحے پر ہے۔

ایک جھوٹا، خطا کار ناصیہ

ہرگز نہیں! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور ناصیہ پکڑ کر گھسیٹیں گے ﴿ایسا ناصیہ جو جھوٹا

ہے، خطا کار ہے

سورہ العلق – آیات 15-16



اس حصے کے کام

- فیصلہ کرنا
- جھوٹ اور سچ
- غلط روئے کی روک تھام
- منصوبہ بندی اور پہل قدمی

جھوٹ کا ارادہ دماغ میں اور کہیں پیدا ہوتا ہی نہیں

فعلی تصویر کشی جھوٹ کے لمحے پیشانی کے پچھلے قشر کی سرگرمی دکھاتی ہے

آسان لفظوں میں

«ناصیہ» سر کا اگلا حصہ ہے، پیشانی کی طرف سے۔ اور قرآن نے اُسے «جھوٹا اور خطا کار» کہا – یعنی جھوٹ اور خطا اسی مقام سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور یہی ہے جو علم اعصاب نے ثابت کیا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سر کے کسی متعین حصے اور جھوٹ جیسے اخلاقی عمل کے درمیان کوئی رشتہ معلوم نہ تھا۔ فلسفی تو بنیادی بات میں بھی اختلاف رکھتے تھے: ارسطو نے سوچ کا مرکز دل میں رکھا تھا، دماغ میں نہیں۔ اور دماغ کے خطوں کے کاموں کا نقشہ انیسویں صدی سے پہلے بننا شروع ہی نہ ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قشرِ پیش پیشانی (Prefrontal Cortex) – جو ٹھیک پیشانی کے پیچھے واقع ہے – فیصلہ سازی، منصوبہ بندی اور روئے کو روکنے کا مرکز ہے۔ اور فعلی مقناطیسی تصویر کشی کی تحقیقات دکھاتی ہیں کہ ارادی جھوٹ خاص اسی خطے کو سرگرم کرتا ہے، کیونکہ اُس میں سچ کو دبانے اور اُس کی جگہ کوئی متبادل گھڑنا پڑتا ہے۔ اور اِس خطے کو نقصان پہنچے تو انسان اپنے روئے پر قابو کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے – جیسا کہ 1848 میں فینیاس گیج کے مشہور واقعے میں ہوا۔

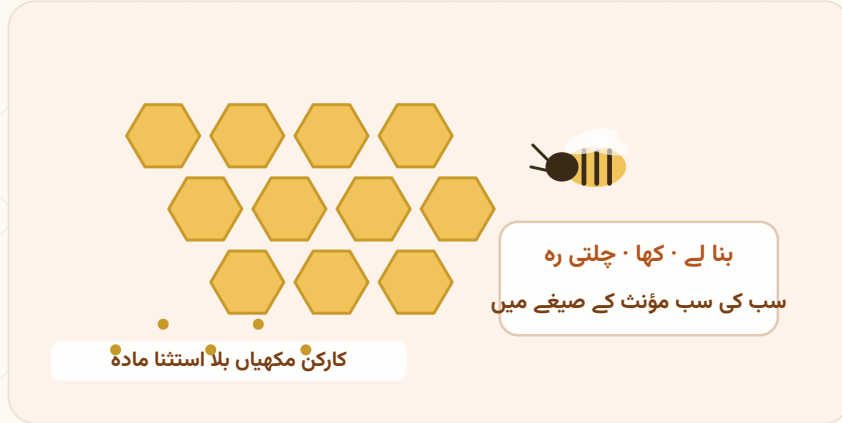
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اِس نسبت کی باریکی پر غور کیجیے۔ آیت نے یہ نہیں کہا: «کسی جھوٹے، خطا کار کا ناصیہ» – یعنی اُس کے مالک کا – بلکہ خود ناصیہ کو جھوٹا اور خطا کار کہا، اور فعل کو شخص کے بجائے عضو سے منسوب کیا۔ اور یہ کسی کام کے مقام کا تشریحی تعین ہے۔ اور اِس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی بات: جس شخص کو آیت نے نشانہ بنایا تھا، اُسے اُس کی سب سے قیمتی چیز میں دھمکی دی جا رہی تھی – اور نہ اُس کے دل کا نام لیا گیا نہ زبان کا، بلکہ اُس کے سر کے اگلے حصے کا: دماغ میں فیصلے اور جھوٹ کی جگہ۔

کارکن مکھیاں... سب کی سب مادہ

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا ۞ پھر ہر طرح کے پھلوں سے کھا اور اپنے رب کے راستوں پر فرمانبرداری سے چل

سورہ النحل – آیات 68-69



ہر مکھی جو آپ کو رس جمع کرتی اور موم بناتی دکھائی دے، مادہ ہے

آسان لفظوں میں

ان آیتوں میں اللہ نے مکھی کو جتنے بھی حکم دیے، سب مؤنث کے صیغے میں ہیں: «اتَّخِذِي، كُلِّي، اسْلُكِي». اور علم کہتا ہے: جو مکھیاں بناتی ہیں، جمع کرتی ہیں اور شہد بناتی ہیں، وہ سب کی سب مادہ ہیں، اُن میں ایک بھی نر نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم دنیا میں عام خیال یہ تھا کہ چھتے کا سربراہ ایک نر بادشاہ ہے — ارسطو نے صراحتاً یہی کہا اور اُسے «بادشاہ» کا نام دیا، اور یورپ والے صدیوں اُس کے پیچھے چلتے رہے اور اُسے King Bee کہتے رہے۔ اور 1668 تک، ولندیزی عالم یان سوامردام کے ہاتھوں، یہ ثابت ہی نہ ہوا کہ چھتے کا سربراہ مادہ ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شہد کی مکھیوں کے چھتے میں تین طبقے ہوتے ہیں: ایک مادہ ملکہ، ہزاروں مادہ کارکن جو موم بناتی ہیں، رس جمع کرتی ہیں، شہد بناتی ہیں، پہرہ دیتی ہیں اور صفائی کرتی ہیں، اور چند سو نر جن کا ملکہ سے جفتی کے سوا کوئی کام نہیں، اور اِس کے بعد وہ مر جاتے ہیں یا نکال دیے جاتے ہیں۔ نر نہ چرنے نکلتا ہے، نہ کچھ بناتا ہے، اور نہ شہد بنانے میں اُس کا سرے سے کوئی حصہ ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

بے در پے تین فعلوں میں مؤنث کے صیغے کی مکمل پابندی، ایسی زبان میں جہاں دونوں جنس جمع ہوں تو مذکر کو غالب کیا جاتا ہے، کوئی نحوی اتفاق نہیں۔ بلکہ یہ تخصیص اور باریک ہو جاتی ہے: یہ تینوں فعل ٹھیک وہی کام ہیں جو مادہ کارکن کے ہیں — گھر بنانا، پھلوں پر چرنا، اور راستوں پر آنا جانا۔ اگر پوری نوع مراد ہوتی تو جمع مذکر کا صیغہ آتا۔ اور یہ اُس کے خلاف ہے جو اُس زمانے کے سب سے بڑے عالم مانتے تھے۔

سماعت بصارت سے پہلے... ہر بار

اور اُس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تاکہ تم شکر کرو

سورہ النحل - آیت 78

کان کام کرتا ہے



ہفتہ 24

آنکھ کام کرتی ہے



ہفتہ 28

سماعت بصارت سے چار ہفتے پہلے مکمل ہوتی ہے

پورے قرآن میں، انسان کی تخلیق کے سیاق میں، بصارت ایک بار بھی سماعت سے آگے نہیں آئی

آسان لفظوں میں

انسان کی تخلیق اور اُس کے آلاتِ ادراک کے ذکر کے سیاق میں، قرآن میں بصارت **ایک بار بھی** سماعت سے آگے نہیں بڑھی۔ اور علم کہتا ہے: جنین کا کان اُس کی آنکھوں سے مہینوں پہلے کام کرنے اور سننے لگتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

آنکھ وہی حس ہے جسے ہر انسان فطرتاً آگے رکھتا ہے: «میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا» «میں نے سنا» سے زیادہ مضبوط ہے، اور چشم دید گواہی خبر سے اوپر بیٹھتی ہے۔ اور ہر زبان میں فطری ترتیب بصارت سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ جنین سنتا بھی ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

کان کا حلزون تقریباً بیسویں ہفتے میں اپنی ساخت مکمل کرتا ہے، اور جنین **چوبیسویں ہفتے** سے آوازوں کا ثابت شدہ جواب دیتا ہے۔ جبکہ پردہ چشم اور بصری راستہ **اٹھائیسویں ہفتے** سے پہلے کارکردگی کے اعتبار سے مکمل نہیں ہوتے۔ اور نومولود پیدائش کے پہلے ہی لمحے اپنی ماں کی آواز پہچان لیتا ہے، جبکہ صاف دیکھنے میں اُسے مہینوں لگ جاتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز کسی ایک جگہ میں نہیں، بلکہ **مکمل اطراد** میں ہے۔ اگر یہ ترتیب اتفاقی ہوتی تو تیرہ مقامات میں کم از کم ایک بار بدل جاتی۔ اور باوجود اِس کے کہ یہ زبان کے عام ذوق کے خلاف ہے، بلااستثنا قائم ہے۔ بلکہ باریکی اور بڑھ جاتی ہے: اِن مقامات پر «السَّمْع» **واحد** آیا ہے اور «الأَبْصَار» **جمع** — کیونکہ سماعت ایک ہی حس ہے جو ہر طرف سے ایک ہی قسم کا ادراک وصول کرتی ہے، جبکہ دو آنکھیں دو مختلف عکس بناتی ہیں جو دماغ میں جوڑ دیے جاتے ہیں۔

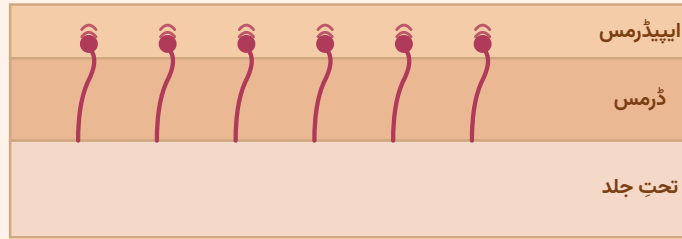
درد جلد میں بستا ہے

جب بھی اُن کی کھالیں پک جائیں گی، ہم اُن کی جگہ دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ

عذاب چکھیں

سورہ النساء - آیت 56

سطح کے قریب گھنے آزاد عصبی سرے



درد کے سبب وصول کنندہ جلد میں ہیں - جلد جل جائے تو احساس ختم

تیسرے درجے کا گہرا جلنا درد نہیں دیتا - کیونکہ درد کے وصول کنندہ خود جل چکے ہوتے ہیں

آسان لفظوں میں

درد کے وصول کنندہ پورے بدن میں پھیلے ہوئے ہیں، مگر سب سے گھنے وہ جلد میں ہیں، اور اس اعتبار سے جسم کا سب سے بھرپور عضو جلد ہی ہے۔ اسی لیے جب جلد گہرائی تک جل جاتی ہے تو اُس جگہ درد کا احساس رک جاتا ہے۔ اور آیت جلد بدل دیتی ہے تاکہ احساس جاری رہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

درد کو پورے بدن کا ایک عام احساس سمجھا جاتا تھا، یا دل کا، یا روح کا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اُس کے خاص عصبی وصول کنندہ ہیں، اور نہ یہ کہ اُن کا کوئی متعین مقام ہے۔ اور درد کے وصول کنندوں کا علمی بیان 1906 میں چارلس شیرنگٹن کے ہاتھوں ہی ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

درد کے وصول کنندہ (Nociceptors) آزاد عصبی سرے ہیں جو جلد کی تہوں میں مرتکز ہیں۔ اور تیسرے درجے کے جلنے میں، جہاں جلد اپنی پوری موٹائی سمیت تباہ ہو جاتی ہے، مریض جلی ہوئی جگہ پر درد کا احساس بالکل کھو دیتا ہے - اور یہ ایک تسلیم شدہ تشخیصی علامت ہے جسے ڈاکٹر جلنے کے درجوں میں فرق کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور علاج کے لیے جلد کی پیوندکاری درکار ہے، تاکہ احساس لوٹ آئے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

علت خود آیت میں بیان ہو چکی ہے: «تاکہ وہ عذاب چکھیں»۔ یعنی جلد کا بدلنا سزا میں اضافہ نہیں، بلکہ اُس کے احساس کے جاری رہنے کی شرط ہے۔ اور یہ دو باتوں کا ایک ساتھ جاننا چاہتا ہے: یہ کہ درد کے احساس کی جگہ ہر چیز سے پہلے جلد ہے، اور یہ کہ جلد پک جائے، یعنی پوری جل جائے، تو احساس ختم ہو جاتا ہے۔ سو آیت نے صرف درد کو بیان نہیں کیا، بلکہ اُس پر ایک منطقی حکم کھڑا کیا جو اس طبی حقیقت کے بغیر درست ہی نہیں بیٹھتا۔

ہضم شدہ غذا اور خون کے بیچ سے خالص دودھ

اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں ایک عبرت ہے: ہم تمہیں اُن کے پیٹوں کے اندر سے، ہضم شدہ غذا اور خون کے بیچ سے، خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے

سورہ النحل – آیت 66



آسان لفظوں میں

وہ سفید خالص دودھ جو آپ پیتے ہیں، گائے کے جسم میں ایسی جگہ بنتا ہے جو آنتوں میں موجود ہضم شدہ غذا اور رگوں میں دوڑتے خون کے **بیچ** ہے۔ اور اس کے باوجود وہ **خالص** نکلتا ہے، نہ اس کا رنگ لیے ہوئے نہ اس کا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دودھ کے بننے کا طریقہ سرے سے معلوم نہ تھا۔ گمان یہ تھا کہ دودھ تھن میں اُسی طرح جمع ہوتا ہے جیسے مشک میں پانی۔ رہا اُسے ہضم شدہ غذا اور خون دونوں سے جوڑنا، اور اُس کی جگہ اُن دونوں کے **بیچ** ٹھہرانا، تو اس کا کسی کو کوئی علم نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

غذا آنتوں میں ہضم ہوتی ہے، پھر اُس کے اجزا خون میں جذب ہو جاتے ہیں۔ خون اُنہیں تھن کے اندر دودھ کے غدود تک لے جاتا ہے، اور وہاں کے پوششی خلیے خون میں سے اپنی ضرورت کی شکر، امینو تیزاب، چکنائی اور نمکیات چن لیتے ہیں، پھر **دودھ کو نئے سرے سے ترکیب دیتے ہیں** اور خارج کرتے ہیں۔ سو دودھ نہ چھنا ہوا خون ہے نہ گھلی ہوئی غذا، بلکہ ایک بنایا ہوا مادہ ہے جس کے بننے کی جگہ نظام ہضم اور دورانِ خون کے درمیان ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حرفِ جر «**مِن** بَيْنَ» ہی وہ جگہ ہے جہاں اعجاز بیٹھا ہے۔ آیت نے «ہضم شدہ غذا اور خون سے» نہیں کہا – کہ پھر دودھ اُن دونوں سے نکالا ہوا اور اُن میں ملا ہوا ہوتا؛ اور نہ «ہضم شدہ غذا اور خون کے بعد» کہا۔ بلکہ کہا «اُن دونوں کے **بیچ** سے» – یعنی بننے کی جگہ **اس سلسلے میں اُن دونوں کے درمیان پڑتی ہے**: ہضم کے بعد اور خون کے اُنہیں پہنچا دینے کے بعد، اور دودھ کے نکلنے سے پہلے۔ پھر نتیجے کو «**خالص**» کہا – یعنی اُس کے نشان سے بالکل خالی جس سے وہ آیا ہے۔ یہ ایک ایسے فعلی راستے کا بیان ہے جو 1628 میں دورانِ خون کی دریافت سے پہلے سمجھا ہی نہ گیا تھا۔

مآخذ: Harvey – De Motu Cordis, 1628 · Guyton & Hall – Textbook of Medical Physiology

ہاتھ دھوئیے، جانے سے پہلے کہ کیوں

جب آپ میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو اپنا ہاتھ برتن میں نہ ڈالے جب تک اسے تین بار نہ دھو لے، کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری

بخاری اور مسلم نے روایت کیا - متفق علیہ

اسے معلوم نہیں کہ رات اس کا ہاتھ کہاں رہا - اُن دیکھے پر قائم علت

1

پانچ بار وضو
دن میں

2

ہاتھ دھونا
بیداری پر

3

مسواک
ہر نماز پر

4

منہ دھونا
اور ناک اور چہرہ

ہاتھ دھونا طب کا سب سے اہم اکیلا احتیاطی اقدام
عالمی ادارہ صحت

طہارت کا ایک روزانہ نظام جو ہر مسلمان پر دن میں پانچ بار لازم ہے

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے بیدار ہونے پر کھانے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ دھونے کا حکم دیا، اور اس کی ایک عجیب علت بیان فرمائی: «اسے معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری» - یعنی ایک ایسا ممکنہ اذیت رسا ہے جو آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جراثیم کسی بھی صورت میں معلوم نہ تھے۔ اور صفائی ظاہر اور بو کا معاملہ تھی: اگر ہاتھ آنکھ میں صاف ہے تو وہ صاف ہے۔ اور کسی چھپے ہوئے تعدیے کا کوئی تصور ہی نہ تھا جو چھونے سے منتقل ہوتا ہو۔ بلکہ یورپ میں اطبا انیسویں صدی تک مُردوں کی تشريح سے اٹھ کر عورتوں کی زچگی کرانے چلے جاتے تھے، بغیر ہاتھ دھوئے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ہاتھ دھونا آج عالمی ادارہ صحت کے اقرار کے مطابق ساری طب کا سب سے اہم اکیلا احتیاطی اقدام ہے، اور اکیلا یہی ہر سال لاکھوں بیماریوں کو روکتا ہے۔ اور یہ 1847ء میں ہنگری کے طبیب سیملووئس کے ہاتھوں دریافت ہوا، جس نے دیکھا کہ اطبا کے ہاتھ دھونے سے زچہ عورتوں کی اموات 18% سے گھٹ کر 2% رہ گئیں - تو اس کے ساتھیوں نے اس کا مذاق اڑایا، اسے نوکری سے نکال دیا گیا اور وہ ایک پاگل خانے میں مرا۔ رہا مسلمان، تو وہ اپنے ہاتھ، چہرہ، منہ، ناک، بازو اور پاؤں دن میں پانچ بار دھوتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دلالت کا مقام علت بیان کرنے میں ہے، حکم میں نہیں۔ صفائی کے حکم کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ذوق ہے یا عادت۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ «اسے معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری»، تو یہ ایک ایسی چیز سے علت بیان کرنا ہے جو نامعلوم اور غیر مرئی ہے - یعنی خطرہ موجود ہے خواہ ہاتھ صاف ہی دکھائی دے۔ اور یہی اُس چھپے ہوئے تعدیے کے تصور کا جوہر ہے جس پر سارا احتیاطی طب کھڑا ہے۔ اور اس کے ساتھ باقی نظام بھی شامل کیجیے: ہر نماز کے وقت مسواک، وضو میں ناک میں پانی چڑھانا اور کلی کرنا، برتن ڈھانپنے کا حکم، پینے کی چیز میں سانس لینے کی ممانعت، ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت، اور غسل کا واجب ہونا۔ ایک مکمل صحتی نظام جو جرثومی نظریے سے بارہ صدیاں پہلے وضع ہو گیا۔

ماخذ Ignaz Semmelweis - childbed fever, 1847-1861 · WHO - Guidelines on Hand Hygiene in Health Care, 2009

ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے... دس برس کا چیلنج

ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود ہلاک ہو گیا ﷺ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا، کچھ کام نہ آیا ﷺ عنقریب وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہو گا

سورہ المسد - آیات 1-3



سب سے خطرناک متن جو لکھا جا سکتا ہے: ایک ایسے شخص پر حتمی فیصلہ جو ابھی مرا بھی نہیں

آسان لفظوں میں

ایک سورہ نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ نبی ﷺ کے چچا - ابو لہب - آگ میں داخل ہوں گے۔ یعنی وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اس کے بعد وہ دس برس سے زیادہ زندہ رہے، اور پورے قرآن کو گرا دینے کے لیے انہیں صرف اتنا کافی تھا کہ جھوٹ ہی سہی، کلمہ پڑھ لیتے - اور انہوں نے ایسا نہ کیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ابو لہب دعوت کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے اور اسے نقصان پہنچانے پر سب سے زیادہ قادر، اور وہ نبی ﷺ کے چچا اور قریش کے ایک سردار تھے۔ اور کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ آنے والے دنوں میں کوئی آدمی کیا بن جائے گا - کتنے ہی سخت دشمن تھے جو لمبی عداوت کے بعد مسلمان ہوئے، جیسے عمر بن خطاب، خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ابو لہب غزوہ بدر کے چند دن بعد مرے - یعنی سورہ کے نزول کے دس برس سے زیادہ عرصے بعد - اپنے کفر پر، ایسے مرض سے کہ ان کے اپنے گھر والے ان سے دور بھاگے۔ اور سیرت و تاریخ کی تمام کتابیں اس پر متفق ہیں، اور اسلام کے مخالفوں میں سے بھی کسی نے اس میں جھگڑا نہیں کیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ کسی دور کی ایسی بات کی پیش گوئی نہیں جس پر کسی کا کوئی اختیار نہ ہو - بلکہ ایک زندہ آدمی کے اپنے اختیار کے بارے میں ہے جو اسے اپنے کانوں سے سن رہا تھا۔ اور وہی اس دعوت کو ڈھا دینے کا سب سے زیادہ حریص تھا۔ اس کے سامنے دس برس سے زیادہ کا وقت تھا کہ ایک جملہ کہہ دیتا - خواہ جھوٹ اور دکھاوے ہی کے طور پر - تو متن اسی دن ڈھ جاتا اور دعوت اسی دن ختم ہو جاتی۔ اس چیلنج کو دس برس سے زیادہ کھلا چھوڑنا، پھر اس کا ٹھیک اسی طرح بند ہونا جیسا کہا گیا تھا، ایسا خطرہ ہے جو کوئی انسان مول نہیں لیتا۔ اس پر یہ بھی کہ سورہ نے یہی فیصلہ ان کی بیوی پر بھی سنایا، اور وہ بھی کفر ہی پر مریں۔ دو میں سے دو، دونوں ایک ساتھ، جھٹلانے کے دس برس سے زیادہ مواقع کے بعد۔

یوسف کا «بادشاہ»... اور موسیٰ کا «فرعون»

اور بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لاؤ، میں اسے اپنے لیے خاص کر لوں ... اور فرعون نے کہا:

مجھے چھوڑو، میں موسیٰ کو قتل کروں

سورہ یوسف 54 – اور سورہ غافر 26



شاہی لقب کا بدلنا ایک ایسی حقیقت ہے جو بیروگلیفی کے حل ہونے سے پہلے معلوم ہی نہ تھی

آسان لفظوں میں

قرآن یوسف کے زمانے کے مصری حکمران کو «بادشاہ» کہتا ہے، اور موسیٰ کے زمانے کے حکمران کو «فرعون» – اور ان میں کبھی خلط نہیں کرتا۔ علمِ مصریات کہتا ہے کہ بالکل یہی درست ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرہٴ عرب میں نہ مصر کے حکمرانوں کے القاب کا کوئی علم تھا اور نہ ان کے بدلنے کی تاریخ کا۔ اور پورے خطے میں مشہور یہی تھا کہ ہر مصری حکمران کو بلا تفریق «فرعون» کہہ دیا جائے۔ بلکہ خود تورات یوسف کے حکمران کو «فرعون» کہتی ہے، سیفرِ پیدائش میں بار بار۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

لفظ «فرعون» کی مصری اصل «پر-عا» (pr-eh) ہے، جس کے معنی ہیں «بڑا گھر» – یعنی خود محل، نہ کہ حکمران کی ذات۔ اور قدیم اور وسطیٰ دونوں سلطنتوں کے پورے دور میں یہی رہا۔ اور خود حکمران کے لیے یہ لقب نئی سلطنت سے پہلے استعمال نہیں ہوا، تقریباً تحتّمس سوم کے عہد میں (15 ویں صدی قبل مسیح)، اور اس کے بعد عام ہوا۔ اور یوسف کا زمانہ اس سے پہلے پڑتا ہے، اور موسیٰ کا اس کے بعد۔ اور یہ بات جدید مصریات کے مراجع میں طے شدہ ہے۔

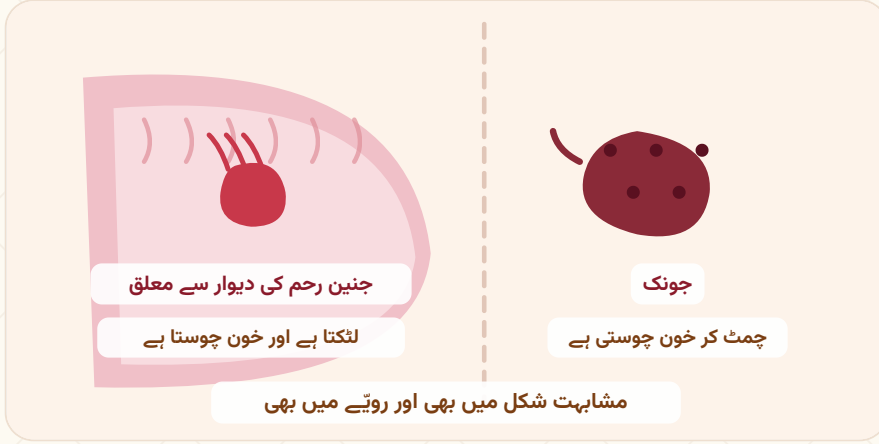
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اطراد ہی دلیل ہے۔ اگر یہ اتفاق ہوتا تو تقریباً تیس مقامات میں کم از کم ایک بار تو دونوں لقب گڈمڈ ہو جاتے۔ لیکن قرآن اس فرق کو پوری طرح نبھاتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ قوی بات یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اہل کتاب کے درمیان رائج تورات کے متن کی مخالفت کرتا ہے – اور وہی واحد ماخذ ہے جس سے نقل کرنے کا الزام اس پر لگایا جاتا ہے۔ اگر نقل کرنے والا کوئی انسان ہوتا تو غلطی بھی ساتھ ہی نقل کر لیتا۔ اور اس تصحیح کا درست ہونا بیروگلیفی کے حل ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا، ایک ہزار برس سے بھی زیادہ بعد۔

علقہ: ایک لٹکی ہوئی چیز جو خون چوستی ہے

اُس نے انسان کو علق سے پیدا کیا

سورہ العلق – آیت 2



تیسرے ہفتے کا جنین: اُس کی شکل اور کام وہی ہیں جو جونک کی شکل اور کام ہیں

آسان لفظوں میں

عربی میں لفظ «علق» کے تین معنی ہیں: **لٹکی ہوئی** چیز، خون چوسنے والی **جونک**، اور **جما ہوا خون**۔ اور جنین اِس مرحلے میں تینوں معنی ایک ساتھ جمع کر لیتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کسی نے تیسرے ہفتے کا جنین نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا حجم دو ملی میٹر سے بھی کم ہے اور خوردبین کے بغیر دکھائی نہیں دیتا۔ ارسطو اور جالینوس نے کہا: جنین پودے کی جڑوں جیسی نالیوں سے رحم سے جڑتا ہے اور ماں کے خون سے غذا لیتا ہے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ شروع کیسے ہوتا ہے: **وہ رحم کی اندرونی جھلی میں دھنستا ہے اور اُس میں معلق ہو جاتا ہے۔**

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

چھٹے دن بلاسٹوسٹ رحم کی اندرونی جھلی میں پیوست ہوتا ہے اور **اُس سے معلق** ہو جاتا ہے۔ پھر اُس کے خلیے ماں کی خون کی نالیاں کھودتے ہیں، یہاں تک کہ خون اُس کے گرد کے خلا بھر دیتا ہے – یعنی وہ **لفظاً خون چوستا ہے**۔ اور تیسرے ہفتے کے جنین کی خوردبینی تصویریں اُسے ایسی شکل میں دکھاتی ہیں جو خم اور پہلو کی بندشوں تک میں جونک سے جا ملتی ہے۔

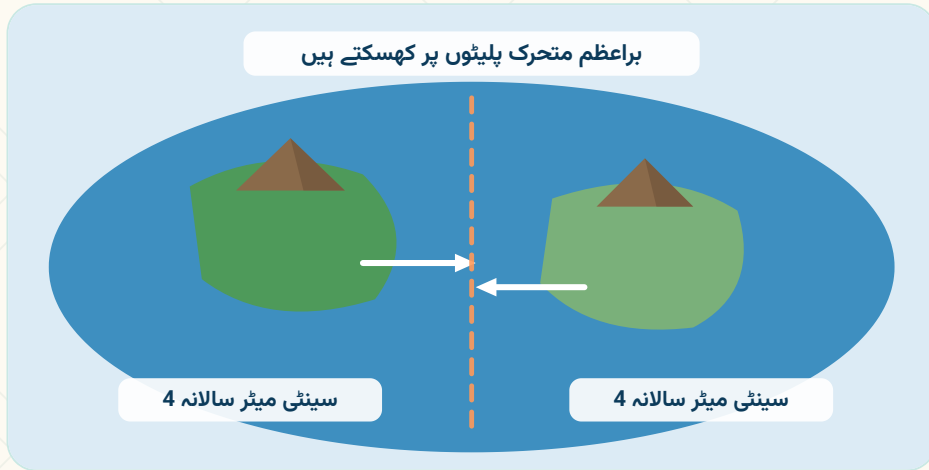
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تینوں معنی کا ایک ہی لفظ میں جمع ہو جانا ہی اعجاز ہے۔ اگر صرف لٹکنا مراد ہوتا تو «معلقہ» کہا جاتا، اور اگر صرف خون مراد ہوتا تو «دم» کہا جاتا۔ مگر «علقہ» ایک ہی وقت میں بیان کرتا ہے: **جگہ** (دیوار سے معلق)، اور **غذا** (خون چوستا ہے)، اور **شکل** (جونک جیسی)، اور **مادہ** (گرد جما ہوا خون)۔ چار خوردبینی حقیقتیں اُس ایک لفظ میں، جو خوردبین کی ایجاد سے ہزار برس پہلے ایک اُمی شخص پر اُتارا گیا۔

پہاڑ چل رہے ہیں اور آپ اُنہیں ٹھہرا ہوا سمجھتے ہیں

اور آپ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں، اُنہیں جما ہوا سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہیں۔

سورہ نمل – آیت 88



پورے پورے براعظم بہت آہستہ چل رہے ہیں، اور جو کچھ اُن پر ہے وہ اُن کے ساتھ چلتا ہے

آسان لفظوں میں

پہاڑ آپ کو کھڑے ہوئے، بے حرکت دکھائی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ **چل رہے ہیں** – اتنے آہستہ کہ آپ کی آنکھ اُسے پکڑ نہیں پاتی، بالکل ویسے ہی جیسے بادل کو ایک لمحے کے لیے دیکھیں تو اُس کی حرکت نظر نہیں آتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تمام انسانوں کے نزدیک پہاڑ مطلق ثبات کی علامت تھے۔ «پہاڑ جیسا مضبوط» ہر زبان کی کہاوت ہے۔ اور کسی نے یہ دعویٰ نہ کیا کہ خود زمین اُن کے نیچے سے کھسک رہی ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ارضی پلیٹوں کا نظریہ، جو بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی سے طے شدہ ہے: زمین کی قشر دیو ہیکل تختوں میں بٹی ہوئی ہے جو تیرتے اور کھسکتے ہیں، اور براعظموں اور پہاڑوں کو چند سینٹی میٹر سالانہ کی رفتار سے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ آج یہ حرکت مصنوعی سیاروں سے ناپی جاتی ہے۔

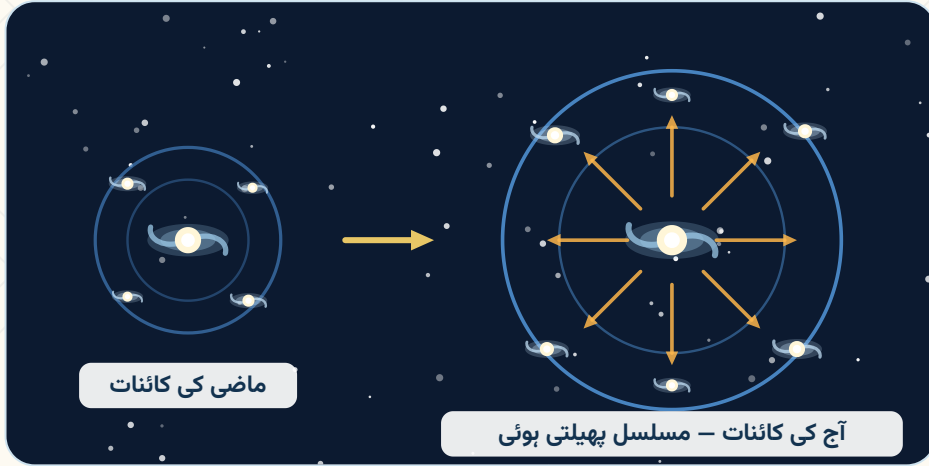
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

خود تشبیہ ہی برہان ہے: «اُنہیں جما ہوا سمجھتے ہیں» – یعنی اُن کا ٹھہرا ہونا صاف طور پر **نظر کا دھوکا** ہے۔ پھر «بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہیں» – اور بادل **افقی، آہستہ اور اجتماعی** حرکت کرتے ہیں، نہ گرتے ہیں نہ اچھلتے۔ سو آیت نے ایک حقیقی حرکت بیان کی اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ نظر کیوں نہیں آتی۔ اور اِس سے بھی باریک بات: پہاڑ اکیلے نہیں چلتے، بلکہ **اپنے گرد کی ہر چیز سمیت** چلتے ہیں – بالکل بادلوں کی طرح۔

کائنات ہر لمحے پھیل رہی ہے

❖ اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا، اور بے شک ہم اُسے وسعت دینے والے ہیں ❖

سورہ ذاریات - آیت 47



کہکشائیں دور ہٹ رہی ہیں، جیسے پھولتے غبارے پر بنے نقطے

آسان لفظوں میں

تصور کیجیے ایک غبارہ ہے جس پر آپ نے چھوٹے چھوٹے نقطے بنا رکھے ہیں، پھر آپ اُسے پھلاتے ہیں۔ ہر نقطہ اپنے پڑوسی سے دور ہٹ جاتا ہے۔ کائنات بالکل یہی کر رہی ہے: آسمان اپنی عمر کے ہر لمحے پھیل رہا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگ - بلکہ بڑے بڑے فلسفی اور سائنس دان بھی - یہی سمجھتے تھے کہ کائنات ساکن اور ثابت ہے، ایک ہی حجم کی، جو نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔ یہ عقیدہ بیسویں صدی تک چھایا رہا، یہاں تک کہ آئن اسٹائن نے خود اپنی مساواتوں میں ایک مصنوعی مستقل شامل کیا تاکہ کائنات کو ساکن رہنے پر مجبور کر سکے!

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

1929 میں ایڈون ہبل نے مشاہدہ کیا کہ دور کی کہکشاؤں کی روشنی **سرخی کی طرف مائل** ہے، یعنی وہ ہم سے بھاگ رہی ہیں۔ اور جتنی دور ہوں، اتنی ہی تیز بھاگتی ہیں۔ کائنات پھیل رہی ہے۔ اور 1998 میں معلوم ہوا کہ یہ پھیلاؤ **تیز تر ہوتا جا رہا ہے**، اور اس کے دریافت کنندگان کو 2011 میں نوبل انعام ملا۔

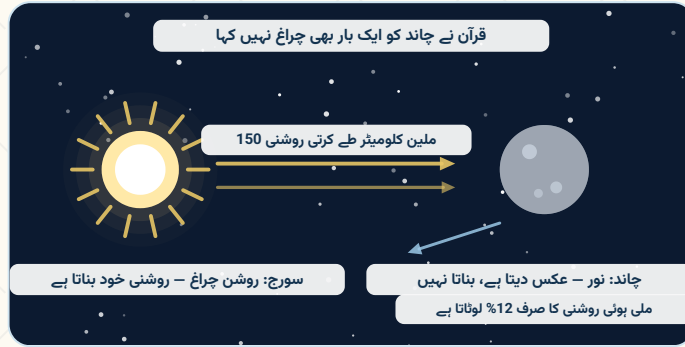
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت میں استعمال ہونے والا لفظ «مُوسِعُونَ» ہے - یہ اسمِ فاعل ہے جو ایسے کام پر دلالت کرتا ہے جو **مُوسِعُونَ** ہے اور **رُکْتَا نہیں**، نہ کہ ماضی کا «ہم نے پھیلا دیا»۔ یعنی پھیلانا اس وقت جاری ہے۔ جزیرہٴ عرب کے ریگستان میں ایک اُمّی شخص، جس کے پاس نہ دوربین تھی نہ طیف پیم، ایسا جملہ کہتا ہے جو پوری انسانیت کے اجماع کے خلاف ہے - اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی فلکیاتی دریافت آ کر حرف بہ حرف اُس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کی توجیہ نہ اتفاق سے ہو سکتی ہے نہ ذہانت سے۔

سورج چراغ ہے... اور چاند نور

بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے، اور اُس میں ایک چراغ اور روشنی دینے والا چاند رکھا۔

سورہ فرقان – آیت 61



لفظوں کا ایک باریک فرق، جو ایک ایسے طبیعی فرق کے عین مطابق ہے جو صدیوں تک معلوم نہ تھا

آسان لفظوں میں

سورج خود سے روشن ہے کیونکہ وہ جل رہا ہے۔ اور چاند کی اپنی کوئی روشنی ہی نہیں ہے۔ وہ ایک تاریک پتھر ہے جو سورج کی روشنی ہم پر لوٹاتا ہے۔ اور قرآن سورج کو ہمیشہ **سراج** اور **وَبَاحٍ** اور **ضیاء** کہتا ہے، اور چاند کو ہمیشہ **نور** اور **مُنیر**۔ اور پوری کتاب میں ایک بار بھی یہ دونوں وصف آپس میں نہیں بدلتے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

روشنی کے سرچشمے اور اُس کے عکس دینے والے میں فرق کرنا معلوم نہ تھا۔ بلکہ قومیں سورج اور چاند دونوں کو دو روشن معبود سمجھ کر پوجتی تھیں، اور دیومالاؤں نے دونوں کو برابر درجے پر «دو روشنیاں» اور «آسمان کی دو آنکھیں» کہا۔ ننگی آنکھ اُن میں فرق نہیں کرتی: دونوں آسمان میں چمکتے قرص ہیں، بلکہ چاند نظر کے لیے زیادہ ٹھنڈا ہے سو خالص نور سے قریب تر لگتا ہے۔ انکسائورس نے مسیح سے چار صدیاں پہلے کہا تھا کہ چاند ایک زمینی جسم ہے جو سورج کی روشنی لوٹاتا ہے۔ مگر یہ یونانی حلقوں میں ایک نظری رائے تھی، جزیرہ عرب تک نہ پہنچی، اور دوربین کے بعد ہی رصد سے ثابت ہوئی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سورج ایک حرارتی جوہری ری ایکٹر ہے: اپنے مرکز میں **ڈیڑھ کروڑ درجے** حرارت پر ہائیڈروجن کو ہیلیم میں بدلتا ہے، اور یوں روشنی اور حرارت پیدا کرتا ہے۔ رہا چاند، تو وہ ٹھنڈا پتھر جیسا جسم ہے جو اپنی طرف سے کوئی نظر آنے والی روشنی نہیں دیتا؛ اور اُس میں سے ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سورج کی لوٹی ہوئی روشنی ہے۔ اور **اُس کی عکس پذیری (Albedo) تقریباً 0.12** ہے۔ یعنی جو روشنی اُس پر پڑتی ہے اُس کا تقریباً 12% لوٹاتا ہے اور باقی نگل لیتا ہے؛ اُس کی سطح حقیقت میں تارکول جیسی سیاہ ہے۔ اسی لیے اُس کی منزلیں بدلتی ہیں: ہم اُس کا صرف روشن حصہ دیکھتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

عربی اِن دو لفظوں میں فرق کرتی ہے: **سراج** وہ ہے جو اپنی آگ اپنے اندر رکھتا ہے، اور **نور** وہ ہے جو جلے بغیر روشنی دے۔ اور مفسرین نے دوربین سے صدیوں پہلے اِس فرق کو صاف لکھا ہے۔ اور دلیل کسی ایک آیت میں نہیں، جسے اتفاق کہا جا سکے، بلکہ **پوری کتاب میں اِس کے تسلسل** میں ہے: سورہ نبا میں سورج کے لیے «چراغ فروزاں»، سورہ نوح میں «چاند کو اُن میں نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا»، سورہ یونس میں «سورج کو ضیاء اور چاند کو نور»، اور سورہ فرقان میں «ایک چراغ اور روشن چاند»۔ چار مقام، اور تقسیم ایک ہی ہے، بگڑتی نہیں۔ اگر یہ اتفاق ہوتا تو تیئیس برس کی اُس وحی میں، جو واقعات کے ساتھ ٹکڑوں میں اُترتی رہی، یہ دونوں وصف کم از کم ایک بار جگہ بدل لیتے۔ **اتفاق اِس قدر پابند نہیں ہوتا، اور کہنے والے کے پاس یہ جاننے کا ایک ذریعہ بھی نہ تھا کہ اِن میں سے کون جلتا ہے اور کون لوٹاتا ہے۔**

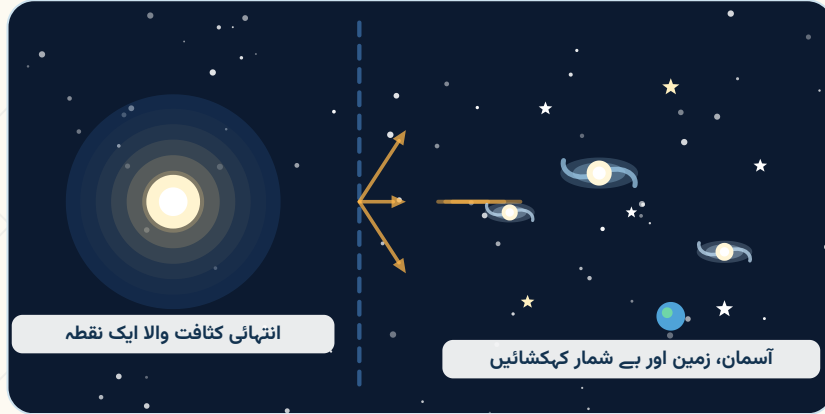
ماخذ: NASA NSDC – Moon Fact Sheet (geometric albedo 0.12) : NASA – Sun: Facts (nuclear fusion) : الطبری – «جامع التیان» (الفرق بین النّیاء والنّور)

دونوں ایک ہی چیز تھے... پھر جدا ہو گئے

کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں پہاڑ کر

جدا کر دیا؟

سورہ انبیا - آیت 30



ایک جڑے ہوئے تودے سے لے کر کہکشاؤں سے بھری ہوئی پھیلتی کائنات تک

آسان لفظوں میں

قرآن کہتا ہے: آسمان اور زمین شروع میں **باہم چپکے ہوئے** ایک ہی چیز تھے، پھر اللہ نے انہیں پہاڑ کر جدا کر دیا۔ بالکل جیسے ایک چھوٹا سا بیج کھلتا ہے اور اُس میں سے پورا درخت نکل آتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

«کائنات کی کوئی ابتدا» کا تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ کائنات **ازلی ہے، اُس کی کوئی ابتدا نہیں**۔ اور جنہوں نے کسی آغاز کا خیال باندھا، انہوں نے لڑتے ہوئے دیوتاؤں کے قصے گھڑ لیے، نہ کہ ایک ہی جسم کے مادی انفصال کا تصور۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نظریۂ عظیم دھماکا (بگ بینگ)، جو آج دنیا بھر میں مسلمہ نمونہ ہے: پوری کائنات **ایک ہی جڑی ہوئی، انتہائی کثیف اور انتہائی گرم حالت** سے شروع ہوئی — نہ کہ فضا کے کسی کونے میں کوئی گولا پھٹا — پھر خود فضا کے ہر مقام پر بیک وقت پھیلنے سے وہ پھٹ کر الگ ہوئی۔ اور تین دلیلوں سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے: کہکشاؤں کا ایک دوسرے سے دور ہٹنا، 1965 میں دریافت ہونے والی «کائناتی پس منظر کی شعاعیں» (جو اُس آغاز کی باقی ماندہ حرارت ہیں)، اور کائنات میں ہائیڈروجن اور ہیلیم کا تناسب۔

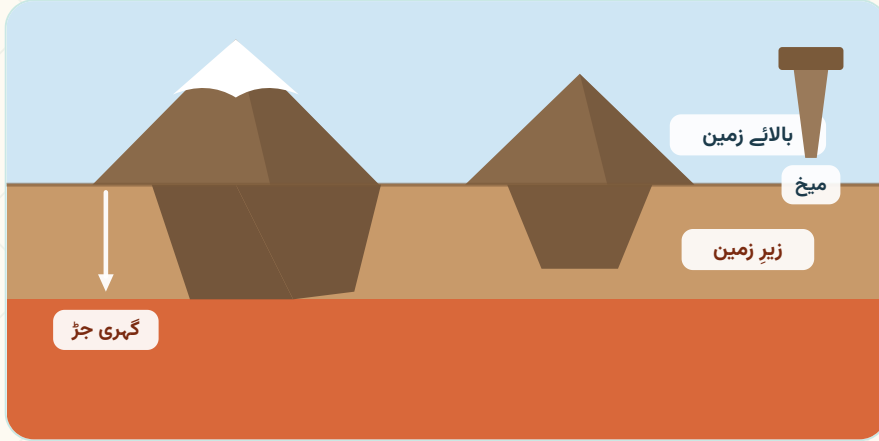
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

عربی میں «رُتِق» کا معنی ہے: وہ چیز جو جڑی ہوئی اور بند ہو، اور «فَتَّق» کا معنی ہے اُسے چیر کر جدا کرنا۔ یہ ایسا دقیق بیان ہے جو کسی تاویل کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ آیت اسے کافروں کے سامنے **چیلنج کی دلیل** کے طور پر پیش کرتی ہے («کیا کافروں نے نہیں دیکھا») — یعنی وہ اس پر شرط باندھ رہی ہے کہ یہ ایک دن سامنے آئے گا۔ اور 1300 سال بعد یہ سامنے آ گیا، اور اس کے دو دریافت کنندگان کو 1978 میں نوبل انعام ملا۔

پہاڑ زمین میں گاڑی ہوئی میخیں ہیں

کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا، اور پہاڑوں کو میخیں؟

سورہ نبا – آیات 6-7



پہاڑ خیمے کی میخ جیسا ہے: ظاہر تھوڑا، اور زمین میں گڑا ہوا حصہ اُس سے کئی گنا

آسان لفظوں میں

جس میخ سے آپ خیمہ گاڑتے ہیں اُس کا ظاہر حصہ چھوٹا ہوتا ہے اور زمین میں گڑا ہوا حصہ بڑا۔ پہاڑ بھی بالکل ایسے ہی ہیں: اُن کی زمین کے نیچے گہری جڑیں ہیں، اُس سے کئی گنا جو آپ اوپر دیکھتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کی نظر میں پہاڑ پتھر کا ایک ڈھیر تھا جو زمین کی سطح پر رکھ دیا گیا ہو، جیسے میز پر کوئی پتھر۔ کسی کے پاس یہ جاننے کا کوئی راستہ نہ تھا کہ اُس کے نیچے کوئی سلسلہ بھی ہے، کیونکہ کھدائی کم گہرے کنوؤں سے آگے نہ جاتی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ارضیات اِسے «پہاڑوں کی جڑیں» کہتی ہے: ہر پہاڑ زمین کی قشر میں اتنی گہرائی تک اترتا ہے جو عموماً اُس کی ظاہری بلندی سے پانچ گنا ہوتی ہے۔ اور یہی جڑیں پہاڑ کو اٹھائے رکھتی ہیں اور اُس کے بوجھ کو متوازن کرتی ہیں، سو قشر مینٹل پر اُس بلندی پر تیرتی ہے جو اُس کی موٹائی اور کثافت طے کرتی ہے — اور یہی «قشری توازن» کہلاتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

لفظ «وَدَّ» (میخ) صرف حجم کی یا نوکدار شکل کی تشبیہ نہیں؛ عربی میں میخ وہ چیز ہے جس کی تعریف اُس کے کام سے ہوتی ہے: ایسا جسم جس کا بیشتر حصہ دفن ہو تاکہ اوپر والی چیز کو تھامے رکھے۔ سو آیت نے پہاڑوں کو دو ایسی خصوصیتیں دیں جو معلوم نہ تھیں: سطح کے نیچے کا سلسلہ، اور تھامنا۔ اور اِس سے پہلے والی بات دیکھیے: «زمین کو بچھونا» — یعنی ایسا فرش جو حرکت کر سکتا ہے، سو میخیں اُسے تھامنے کے لیے آئیں۔

دو سمندر جو ملتے ہیں اور گھلتے نہیں

اُس نے دو سمندر بہائے جو آپس میں ملتے ہیں؛ اُن کے درمیان ایک برزخ ہے، وہ اُس سے آگے نہیں

بڑھتے۔

سورہ رحمن – آیات 19-20



دو پانی جو نمکیات اور حرارت میں مختلف ہیں، اور اُن کے درمیان ایک ایسا حاجز جو آنکھ نہیں دیکھتی اور آلات پڑھ لیتے ہیں

آسان لفظوں میں

جب دو مختلف سمندر ملتے ہیں تو وہ فوراً آپس میں نہیں مل جاتے، جیسا آپ سمجھتے ہیں۔ اُن کے درمیان ایک **حاجز** باقی رہتا ہے جو ایک کے پانی کو دوسرے کے پانی سے جدا رکھتا ہے، سو ہر سمندر اپنا رنگ، اپنا کھاراپن اور اپنی حرارت تھامے رہتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ہر انسان کے نزدیک یہ بدیہی تھا کہ پانی جب پانی سے ملے تو فوراً اُس میں گھل جاتا ہے — جیسے دو پیالے پانی کے مل جاتے ہیں۔ اور پانی اور پانی کے درمیان کسی «دیوار» کا تصور ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

علم بحار **حقیقی آبی حاجزوں** کا وجود ثابت کرتا ہے، جنہیں «فرنٹ» اور «ہیلوکلائن» کہتے ہیں: نمکیات، کثافت اور حرارت کا فرق ایک تنگ منتقلی علاقہ بناتا ہے جو **کثافت میں نہایت تیزی سے بدلتا** ہے، سو بھاری پانی ہلکے کے نیچے سرک جاتا ہے، اور دونوں صرف اُس وقت گھلتے ہیں جب کوئی اضطراب بھاری پانی کو کششِ ثقل کے خلاف اٹھائے۔ اور یہ آبنائے جبل الطارق پر ناپا جا چکا ہے: بحیرہ روم کا زیادہ کھارا اور بھاری پانی تقریباً ایک سو بیس میٹر گہرائی پر بحر اوقیانوس کے نیچے سے سرکتا ہوا نکلتا ہے، پھر نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ ایک ایسا حاجز جو آنکھ نہیں دیکھتی، اور آلات پڑھ لیتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

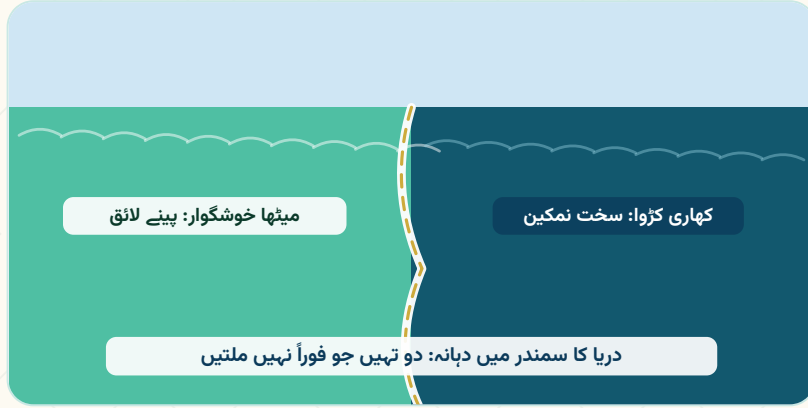
آیت نے صرف عدم اختلاط کا ذکر کر کے بس نہیں کیا؛ اُس نے سبب کا نام لیا: «برزخ» — اور عربی میں برزخ وہ حاجز ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو۔ پھر اُس کا اثر بیان کیا: «لَا يَبْغِيَانِ» یعنی اُن میں سے کوئی دوسرے پر زیادتی نہیں کرتا۔ یہ ایک ایسے مظهر کا بیان ہے جو بیسویں صدی میں نمکیات اور کثافت کی آلاتی پیمائش سے پہلے دریافت ہی نہ ہوا تھا۔ اور ایک دوسری آیت میں وصف اور بھی باریک ہو گیا: «اور اُن کے درمیان ایک برزخ اور **روکی ہوئی آڑ بنا دی**»۔

میٹھا اور خوشگوار... اور کھاری اور کڑوا

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا کر چلایا، یہ میٹھا خوشگوار اور یہ کھاری کڑوا، اور ان

دونوں کے درمیان ایک برزخ اور ایک روکی ہوئی آڑ رکھ دی

سورہ الفرقان – آیت 53



دریاؤں کے دبانوں پر میٹھا پانی کھاری کے اوپر ایک واضح حد کے ساتھ تیرتا ہے

آسان لفظوں میں

جب میٹھا دریا کھاری سمندر میں گرتا ہے تو دونوں پانی فوراً نہیں ملتے۔ ان کے درمیان ایک **حاجز** باقی رہتا ہے جسے مصنوعی سیارے صاف دیکھ لیتے ہیں، اور جو دسیوں کلومیٹر تک پھیلا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سب لوگوں کے نزدیک پانی تو پانی ہے، جو بدابنا پانی سے مل جاتا ہے۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ میٹھا پانی کھاری سے **کثافت میں ہلکا** ہے، اور یہی فرق اکیلا دونوں کو نہ در نہ کر دیتا ہے، سو میٹھا اس کے اوپر ایک ایسی تہ میں تیرتا ہے جو نہایت سست رفتاری ہی سے گھلتی ہے۔ رہا ان دونوں کے درمیان کی چیز کو «روکی ہوئی آڑ» کہنا، تو یہ ایک عجیب تعین ہے جس کی عام مشاہدے میں کوئی نظیر نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بڑے دریاؤں کے دبانوں پر – جیسے ایمیزون، کانگو اور مسیسیپی – میٹھا پانی سمندر میں دسیوں کلومیٹر تک **اپنا رنگ اور اپنی کثافت سنبھالے** چلا جاتا ہے، اور جدائی کی لکیر خلا سے دکھائی دیتی ہے۔ اور سبب کثافت، نمکیات اور حرارت کا اختلاف ہے، جس سے ایک تنگ انتقالی علاقہ بنتا ہے جسے «**ہیلوکلائن**» کہتے ہیں اور وہ گھلنے کو سخت سست کر دیتا ہے۔ اور خلا بازوں نے اس منظر کی بار بار تصویریں لی ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

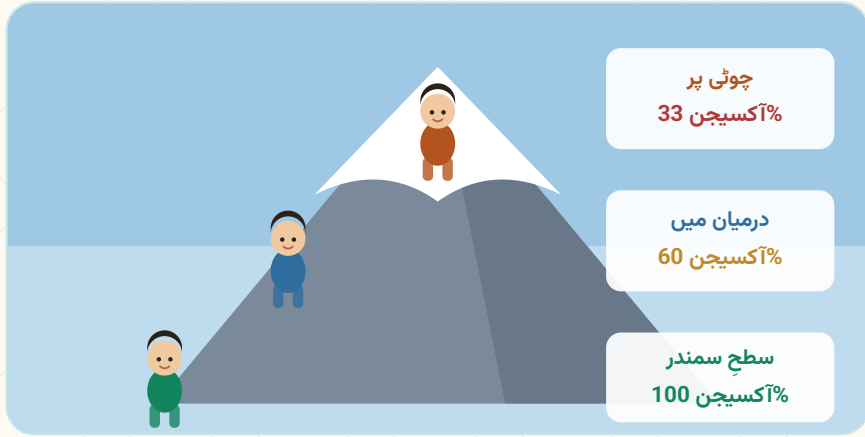
اس آیت اور سورہ الرحمن کی آیت کے درمیان ایک ایسا باریک فرق ہے جس کی طرف صرف وہی متوجہ ہوتا ہے جو جانتا ہو۔ سورہ الرحمن میں بات دو کھاری سمندروں کی ہے جن کی خاصیتیں مختلف ہیں، اور ان کے درمیان کا فاصل ایک ہی لفظ سے آیا: «برزخ»۔ رہا یہاں – جہاں ملاقات **میٹھے اور کھاری** کے درمیان ہے – تو یہاں ایک دوسری صفت بڑھا دی گئی: «اور ایک روکی ہوئی آڑ»، یعنی ایک پکی، سخت ممانعت۔ اور طبیعی سبب واضح ہے: میٹھے اور کھاری کے درمیان کثافت کا فرق دو کھاری پانیوں کے فرق سے **کہیں زیادہ شدید** ہے، سو جدائی زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط ہے۔ سو لفظ کی شدت ٹھیک ٹھیک مظهر کی شدت کے مطابق آئی۔

جتنا بلند چڑھیں گے، اُتنا سینہ تنگ ہوگا

اور جسے وہ گمراہ کرنا چاہے، اُس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان

میں چڑھ رہا ہو

سورہ الانعام – آیت 125



جتنا اوپر جائیں گے آکسیجن اتنی کم ہوگی، تو سانس تنگ ہوگا اور گھٹن بڑھے گی

آسان لفظوں میں

اگر آپ کسی بہت بلند پہاڑ پر چڑھیں تو محسوس کریں گے کہ سینہ تنگ ہو رہا ہے اور سانس لینا مشقت بن گیا ہے۔ جتنا اوپر جائیں گے، سینہ اُتنا ہی تنگ ہوگا۔ اور قرآن نے اسے منہ موڑنے والے کے سینے کی تنگی کی مثال بنایا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس ماحول میں انسان زیادہ سے زیادہ کسی معمولی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا تھا، اور کوئی بلندی اور تنگی سانس کے درمیان **درجہ بہ درجہ** ربط نہ جوڑتا تھا۔ بلکہ یہ تک معلوم نہ تھا کہ ہوا کا کوئی وزن یا دباؤ ہے؛ ٹوریچلی نے فضائی دباؤ 1643 سے پہلے ناپا ہی نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جتنا اوپر چڑھیں گے فضائی دباؤ اُتنا گھٹے گا اور خون تک پہنچنے والی آکسیجن اتنی کم ہوگی۔ 3500 میٹر پر یہ سطح سمندر کی قدر کا تقریباً 60% رہ جاتی ہے، اور کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر تقریباً 33%۔ نتیجہ تنگی سانس، سینے کی گھٹن اور سر درد ہے – جسے **بلندی کا مرض** کہتے ہیں۔ اسی لیے ہوائی جہازوں میں مصنوعی دباؤ کے نظام لگائے جاتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایک ہی فقرے میں تین باریکیاں۔ پہلی: چڑھائی اور سینے کی تنگی کو باہم جوڑنا ہی۔ دوسری: لفظ «حَرَجًا» تنگی کے بعد مزید تنگی کا مفہوم دیتا ہے – یعنی شدت میں تدریج۔ تیسری اور سب سے باریک: صیغہ «يَصْعَدُ» – صاد اور عین کی تشدید کے ساتھ – عربی میں چڑھائی کی مشقت اور تھوڑا تھوڑا کر کے اُسے جھیلنے کا مفہوم دیتا ہے، محض بلند ہونے کا نہیں۔ تو خود صیغہ وہ تدریج اُٹھائے ہوئے ہے جسے آج علم وظائف اعضا بیان کرتا ہے۔

بار آور ہوائیں — پودوں اور بادلوں کو بیاہتی ہیں

❖ اور ہم نے بار آور ہوائیں بھیجیں، پھر آسمان سے پانی اُتارا اور اُس سے آپ کو سیراب کیا ❖

سورہ الحجر — آیت 22



ہوا پودوں کو زیر گل سے بار آور کرتی ہے، اور بادلوں کو برقی بار اور گرد سے

آسان لفظوں میں

ہوا صرف چیزوں کو ہلاتی نہیں — وہ **بیاہتی** ہے۔ وہ زیر گل ایک پھول سے دوسرے پھول تک لے جاتی ہے تو وہ پھل لاتے ہیں، اور گرد اور برقی بار بادل تک لے جاتی ہے تو وہ برستا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ہوا محض دھکیلنے اور ڈھونے کی طاقت تھی: جہاز چلاتی اور گرد اُڑاتی۔ ربا یہ کہ اُس کا **بار آوری میں کوئی کردار** ہے، تو یہ معلوم نہ تھا؛ بلکہ یہ تک ثابت نہ تھا کہ پودوں میں نر اور مادہ ہوتے ہیں، یہاں تک کہ 1694 میں جرمن عالم کامیراریوس نے یہ ثابت کیا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ہوا سے زیرگی ہزاروں نباتاتی انواع کے تولید کا ذریعہ ہے — گندم، چاول، مکئی، کھجور اور صنوبر۔ اور بادلوں میں: ہوا گرد اور نمک کے **تکثیفی مرکزے** لے جاتی ہے جن کے گرد آبی بخارات لپٹ کر قطرے بن جاتے ہیں، اور وہ بادل کے اوپر اور نیچے کے درمیان برقی بار الگ کر دیتی ہے تو بجلی بنتی ہے اور بارش اُترتی ہے۔ ان مرکوز کے بغیر بادل سرے سے برستا ہی نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

«لَوَاقِح» «لَوَاقِح» کی جمع ہے، اور عربی میں فعل «لَقَّحَ» خاص بار آوری اور جوڑا ملانے کے لیے ہے — اسی سے کھجور کی تلقیح ہے، جو عرب کھجور ہی میں ہاتھ سے کرنا جانتے تھے۔ تو اس فعل کو خود **ہوا** کی طرف منسوب کرنا ایک ایسے کردار کا اثبات ہے جو معلوم نہ تھا۔ اور اس سے بھی باریک بات: آیت نے بار آوری کے فوراً بعد بارش کا اُترنا رکھا («فَأَنْزَلْنَا») — یعنی ہوا بادل کو بھی بار آور کرتی ہے تو وہ بارش پیدا کرتا ہے۔ اور یہی حرف بہ حرف جدید علم موسمیات ہے۔

آسمان میں پہاڑ، اور اُن میں اولے

اور وہ آسمان سے، اُس میں جو پہاڑ ہیں اُن میں سے، اولے اُتارتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے اُن سے پہنچاتا ہے

سورہ النور – آیت 43



رُکام بادل: ایک عظیم تودہ جو عمودی بلند ہوتا ہے گویا آسمان میں کوئی پہاڑ ہو

آسان لفظوں میں

اولے – برف کے دانے – ہر بادل سے نہیں گرتے۔ وہ صرف اُن بھاری بادلوں سے گرتے ہیں جو **آسمان میں پہاڑوں کی طرح بلند ہوتے ہیں**، جن کی بلندی زمین کے سب سے اونچے پہاڑ سے کئی گنا ہوتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

زمین سے بادل ایک افقی پھیلی ہوئی سطح دکھائی دیتا ہے، پہاڑ نہیں۔ اور بادل کی بلندی جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ یہ سمجھنے کا کہ بادلوں کی شکلیں اور بلندیاں مختلف ہوتی ہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اولے صرف **رُکامی مُزنی بادل** میں بنتے ہیں: ایک عمودی تودہ جس کی بلندی 8 سے 15 کلومیٹر ہوتی ہے – یعنی کوہ ایورسٹ سے بھی اونچی۔ اُس کے اندر اُٹھتے دھارے پانی کے قطرے کو بار بار اوپر لے جاتے ہیں جہاں وہ تہ پر تہ جم جاتا ہے، یہاں تک کہ بھاری ہو کر گر پڑے۔ اسی لیے اگر آپ ایک اولہ چیر دیں تو اُس میں درخت کے تنے کے حلقوں جیسے حلقے نظر آئیں گے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

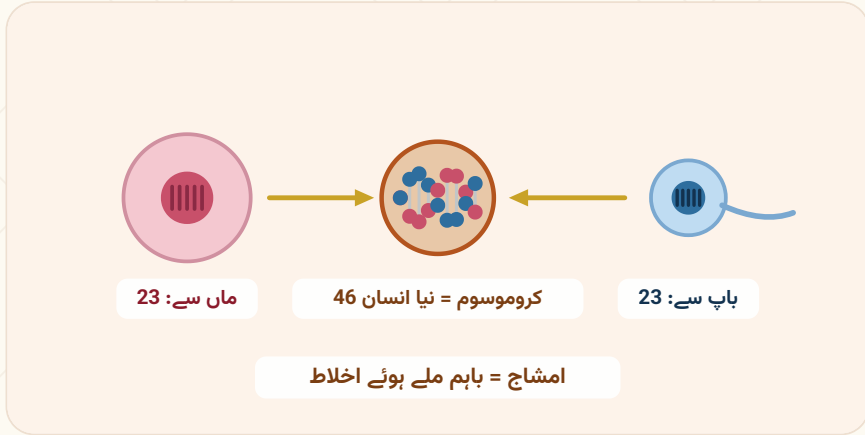
یہ تعبیر چند لفظوں میں تین باتیں دیتی ہے: بادل کی ایک **پہاڑی، عمودی** صورت ہوتی ہے؛ اولے اُن کے اندر ہوتے ہیں، اُن کے اوپر نہیں؛ اور وہ **انہی سے** گرتے ہیں، باقی بادلوں سے نہیں۔ اور یہی حصر آیت کی سب سے باریک بات ہے، اور زمین پر کھڑا کوئی شخص اسے جان نہیں سکتا۔

نطفہ امشاج... ملا ہوا پانی

بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اُسے آزمائیں، پھر اُسے سننے والا

دیکھنے والا بنایا

سورہ الانسان - آیت 2



پہلا خلیہ ایک چیز نہیں، بلکہ دو والدین کے دو نصفوں کا آمیزہ ہے

آسان لفظوں میں

انسان کی ابتدا کوئی ایک پانی نہیں - بلکہ دو مادوں کا آمیزہ ہے: آدھا باپ سے اور آدھا ماں سے، جو آپس میں گھل مل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عام عقیدہ یہ تھا کہ بچہ صرف مرد کے پانی سے بنتا ہے، اور ماں محض ایک برتن اور وہ زمین ہے جس میں بیج اُگتا ہے۔ یہ ارسطو کی صریح عبارت ہے، اور صدیوں طب پر چھائی رہی۔ اور عورت کا بیضہ 1827 میں کارل فون بیئر کے ہاتھوں ہی دریافت ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بارآوری: 23 کروموسوم اٹھائے ہوئے ایک سپرم 23 کروموسوم اٹھائے ہوئے بیضے سے مل جاتا ہے، اور 46 کروموسوم والا ایک ہی خلیہ بنتا ہے، جو پورے انسان کی اصل ہے۔ سو پہلا نطفہ دو برابر اجزا کا حقیقی آمیزہ ہے، کوئی ایک ہی مادہ نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

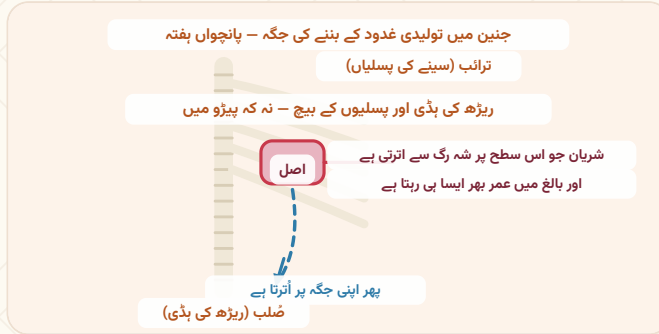
لفظ «امشاج» «مَشَج» کی جمع ہے، اور لغتوں میں اس کے معنی: ایسے آمیزے جو ایک دوسرے میں اس قدر گھل مل جائیں کہ ایک کو دوسرے سے پہچانا نہ جا سکے۔ اور یہ ایک واحد کی صفت ہے («نطفہ» واحد ہے) - یعنی وہ ایک ہی نطفہ خود آمیزہ ہے۔ اور یہ ارسطو کے اُس مذہب کی تصحیح کرتا ہے جو دو ہزار برس دنیا پر حکومت کرتا رہا۔ اور ایک دوسری آیت میں مزید تفصیل ہے: «اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا»، پھر «نطفے سے»، جب وہ ٹپکایا جائے - اور قرآن نہ و مادہ کے فرق کو نطفے کی طرف منسوب کرتا ہے، رحم کی طرف نہیں۔

پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے

پس انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں

کے درمیان سے نکلتا ہے

سورہ طارق – آیات 5-7



غدود یہیں بنتا ہے، پھر نیچے اترتا ہے۔ اور اس کی شریان کبھی ساتھ منتقل نہیں ہوتی

آسان لفظوں میں

آیت کہتی ہے کہ تخلیق کا پانی پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے - یعنی ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں کے بیچ سے۔ اور علم جنین کہتا ہے کہ تولیدی غدود بالکل اسی جگہ بنتا ہے، اور اس کے بعد ہی اپنی معلوم جگہ کی طرف اترتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم تشریح عضو کو وہیں دیکھتی تھی جہاں وہ اسے پاتی تھی۔ بقراط، جالینوس اور ان کے بعد والوں نے تخلیق کے پانی کا سرچشمہ کبھی دماغ میں تلاش کیا اور کبھی بدن کے سارے اعضا میں۔ رہا یہ کہنا کہ اس کا سرچشمہ پیٹھ کے بالائی حصے میں پیٹھ اور سینے کے درمیان ایک جگہ سے لگا ہوا ہے - ایسی جگہ جس کا بظاہر کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں - تو یہ مشاہدے سے کبھی اخذ نہیں ہو سکتا، کیونکہ عضو کا بننا صرف اس جنین میں نظر آتا ہے جس کی لمبائی چند ملی میٹر ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پانچویں ہفتے میں تولیدی غدود اس چیز پر ظاہر ہوتا ہے جسے بولی تناسلی ابھار کہتے ہیں؛ یہ ایک پٹی ہے جو پیٹھ کی پچھلی دیوار سے نچلے چھاتی کے اور بالائی کمر کے مہروں کی سطح پر چپکی ہوتی ہے - یعنی ٹھیک ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے پنجرے کے درمیان۔ پھر وہ ایک لمبے سفر میں اپنی آخری جگہ کی طرف اترتا ہے۔

اور پیچھے رہ جانے والا نشان اصل کو ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیتا ہے: اسے غذا پہنچانے والی شریان پڑوس کی شرونی رگوں سے نہیں نکلتی، جیسا کہ اس کی موجودہ جگہ کا تقاضا ہے، بلکہ دوسرے کمر کے مہرے کے پاس بطنی شہ رگ سے اترتی ہے - جہاں وہ پہلے تھا۔ اور یہی حال اس کی لمفی نالیوں اور اعصاب کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رسولی پیٹھ کے بالائی حصے کی گانٹھوں تک پھیلتی ہے، شرونی گانٹھوں تک نہیں - اور یہ ایک عملی قاعدہ ہے جسے سرطان کا ہر معالج جانتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

جو بات ٹھہرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ یہ وصف اس سے مطابقت نہیں رکھتا جو آنکھ دیکھتی ہے۔ جو مشاہدے سے بیان کرتا ہے وہ اس جگہ کا ذکر کرتا ہے جہاں وہ عضو کو پاتا ہے، نہ کہ اس جگہ کا جسے عضو ولادت سے مہینوں پہلے چھوڑ چکا۔ چنانچہ متن ایک منشا کی طرف اشارہ کرتا ہے، مستقر کی طرف نہیں - اور عجیب بات یہی ہے۔

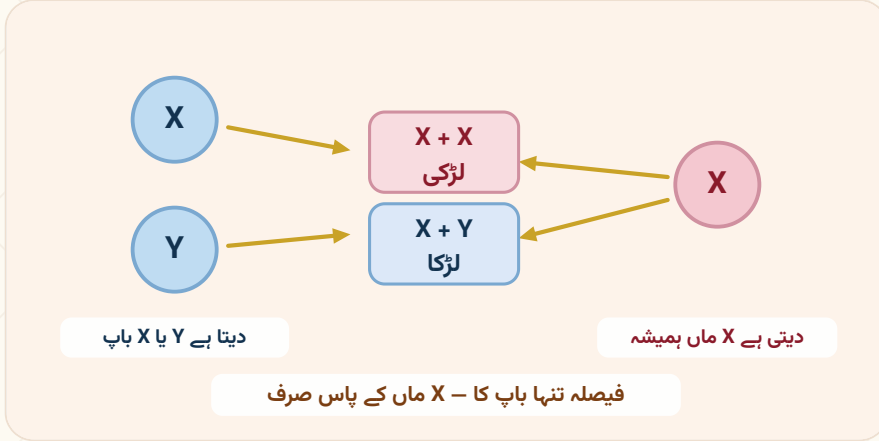
اور یہاں ایک حد ہے جو صاف کہہ دینی چاہیے: پہلے مفسرین نے آیت کو «مرد کی پیٹھ اور عورت کے سینے» پر سمجھا، اور یہ ایک وجہ لغوی فہم ہے جو رد نہیں کیا جاتا۔ ہم یہاں یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ تشریحی تفسیر ہی متعین ہے، اور نہ ہم اکیلے اسی پر بنیاد رکھتے ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں وہ اسی میں محصور ہے: کہ یہ دونوں لفظ حرف بہ حرف اس جگہ کو بیان کرتے ہیں جسے علم جنین نے تیرہ صدیوں بعد اس پانی کا منشا ثابت کیا۔ اور یہ کہ یہی جگہ آج بھی ہر زندہ انسان کی تشریح میں اپنا اعلان کرتی ہے، ایک ایسی شریان کے راستے میں جس کی توضیح اس کے سوا درست نہیں ہوتی کہ عضو نے وہیں سے آغاز کیا تھا۔

ماخذ Moore & Persaud - The Developing Human (the genital ridge) - The genital ridge - where the gonad first forms - The gonadal artery - still arising from the aorta at L2

لڑکا یا لڑکی... فیصلہ باپ کا ہے

اور یہ کہ اُسی نے جوڑا پیدا کیا — نر اور مادہ — نطفے سے، جب وہ ٹپکایا جاتا ہے

سورہ نجم — آیات 45-46



بچے کی جنس بارآوری کے لمحے ہی طے ہو جاتی ہے — اُس کے مطابق جو جرثومہ منویہ لے کر آتا ہے

آسان لفظوں میں

بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ یہ فیصلہ ماں کا کبھی نہیں ہوتا — بلکہ **باپ** کا ہے۔ کیونکہ ماں کے پاس صرف ایک ہی قسم ہوتی ہے، جبکہ باپ دونوں قسمیں رکھتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عورتوں کو بیٹیاں جننے پر ملامت کی جاتی تھی — اور بعض معاشروں میں آج بھی کی جاتی ہے — اور عورت کو صرف اِس لیے طلاق دے دی جاتی تھی کہ وہ «بیٹے نہیں جنتی»۔ یونانی فلسفی انباذقلیس کا یہ نظریہ عام تھا کہ جنس کا فیصلہ رحم کی حرارت کرتی ہے، اور صدیوں تک طب میں یہی مانا گیا کہ لڑکا رحم کی دائیں جانب سے ہوتا ہے اور لڑکی بائیں جانب سے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جنسی کروموسوم: عورت XX ہے اور مرد XY۔ بیضہ ہمیشہ X رکھتا ہے، بغیر کسی استثنا کے؛ جبکہ جرثومہ منویہ X بھی رکھ سکتا ہے اور Y بھی۔ اگر بیضہ X والے جرثومے سے ملے تو بچہ لڑکی ہوگا، اور اگر Y والے سے ملے تو لڑکا۔ **یعنی جنس کا تعین مکمل طور پر باپ کی طرف سے ہوتا ہے۔** یہ 1905 میں نیٹی سٹیونز نے دریافت کیا۔

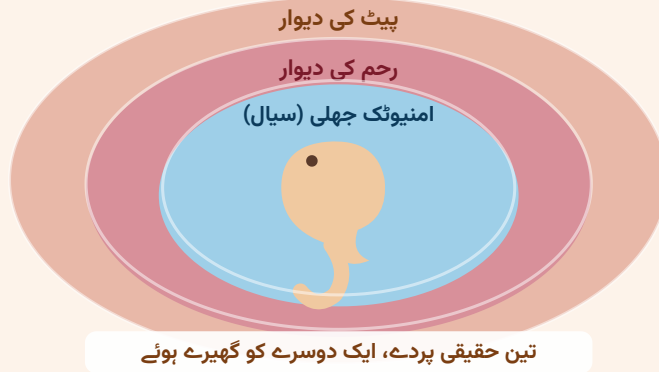
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نر اور مادہ کے جوڑے کی تخلیق کو **نطفے سے، جب وہ ٹپکایا جاتا ہے** منسوب کرتی ہے — اور جو فعل یہاں آیا ہے وہ خاص مرد کے پانی کے لیے ہے۔ یوں سرچشمہ بغیر کسی اِہام کے متعین کر دیا گیا۔ اگر یہ کلام انسانی ہوتا، ایسے ماحول میں جہاں بچے کی جنس پر عورت کو ملامت کی جاتی تھی، تو محفوظ راستہ یہی تھا کہ خاموش رہتا یا رواج کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ مگر اِس نے **رائج تہذیبی تصور کی صریح مخالفت کی اور معاملہ باپ کی طرف منسوب کیا** — اور تیرہ صدیوں بعد سائنس اِس کی تصدیق کرنے آگئی۔

تین اندھیروں میں

❖ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، تخلیق کے بعد تخلیق، تین اندھیروں میں ❖

سورہ زمر – آیت 6



تین تہ بہ تہ پردے: پیٹ کی دیوار، پھر رحم کی دیوار، پھر جنینی جھلیاں

آسان لفظوں میں

پیٹ کا بچہ کسی ایک تاریک کمرے میں نہیں ہوتا — بلکہ **تین کمروں** میں، ایک دوسرے کے اندر: ماں کے پیٹ کی دیوار، پھر رحم کی دیوار، پھر پانی کی وہ تھیلی جو اُسے گھیرے ہوئے ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

نہ حاملہ عورتوں کی تشریح ہوتی تھی، نہ رحم کی ساخت کا کوئی علم تھا۔ بدیہی تصور یہی تھا کہ بچہ **ایک ہی اندھیرے** میں ہے: اپنی ماں کے پیٹ کے اندر۔ مگر تین متعین اندھیروں کو گن کر بتانا ایسا دعویٰ ہے جس کے لیے ایک ایک تہ کو الگ جاننا ضروری ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جنین کو تین یکے بعد دیگرے پردے گھیرے ہوئے ہیں: **پیٹ کی اگلی دیوار**، پھر **رحم کی دیوار** اپنی تین عضلاتی تہوں کے ساتھ، پھر **جنینی جھلیاں** (امنیون اور کوریون) اور اُن کے درمیان کا سیال۔ ان میں سے ہر ایک بذاتِ خود روشنی روکتا ہے، اور یہ باہر سے اندر کی طرف بالکل اُسی ترتیب سے ہیں جس ترتیب سے ذکر ہوا۔

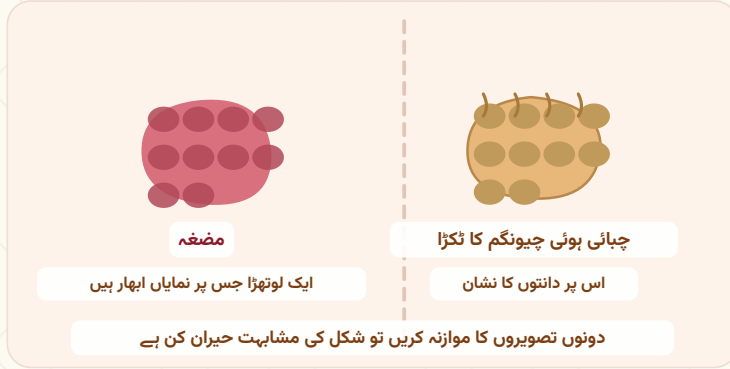
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ کن بات عدد ہے۔ قرآن نے نہ «اندھیرے میں» کہا، نہ مبہم طور پر «اندھیروں میں»، بلکہ متعین کیا: «**تین**»۔ اور عدد کی تعیین، اگر غلط ہو، فوراً جھٹلائی جا سکتی ہے۔ پھر یہ ایک اور نہایت باریک تعبیر کے ساتھ آیا: «تخلیق کے بعد تخلیق» — یعنی پے در پے مراحل، جن میں سے ہر مرحلہ اپنے سے پہلے والے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ یوں ایک ہی آیت میں **جگہ کا اُس کی تہوں سمیت** اور **وقت کا اُس کے مراحل سمیت** بیان جمع ہو گیا۔

مُضغہ: دانتوں کے نشان والا لوتھڑا

پھر مُضغے سے، جو شکل پا چکا ہو اور جو نہ پایا ہو، تاکہ ہم تم پر واضح کر دیں

سورہ حج - آیت 5



چوتھے ہفتے کا جنین: ابھرے ہوئے سومائٹ، جیسے چبائے ہوئے لقمے پر دانتوں کے نشان

آسان لفظوں میں

عربی میں «مُضغہ» کے معنی ہیں وہ لقمہ جسے آپ نے اپنے دانتوں سے چبایا ہو۔ اور جنین اس مرحلے میں ایک چھوٹا سا لوتھڑا ہے جس پر ابھار اور گڑھے ہیں، بالکل جیسے چیونگم کے ٹکڑے پر دانتوں کے نشان۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اس مرحلے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اسے تصور کرنے کی کوئی کوشش جنین کو یا تو خون بتاتی، یا ننھے انسان کی شکل۔ مگر اسے چبائی ہوئی وہ چیز جس پر دانتوں کے نشان ہوں کہنا ایسی عجیب تعبیر ہے جو اُس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی جس نے اسے دیکھا نہ ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

چوتھے ہفتے میں جنین کی پشت پر یکے بعد دیگرے ڈلیاں نمودار ہوتی ہیں جنہیں سومائٹ (Somites) کہتے ہیں، اور ان کے درمیان گہرے شکاف ہوتے ہیں، جس سے جنین چبائے ہوئے ٹکڑے جیسا لگتا ہے۔ ماہر جنینیات کیتھ مور نے اس مرحلے کے جنین کے پہلو میں چیونگم کا چبایا ہوا ٹکڑا رکھ کر تصویر لی، اور مشابہت حیران کن تھی۔ ان میں سے بعض اعضا بن جاتی ہیں اور بعض ختم ہو جاتی ہیں۔

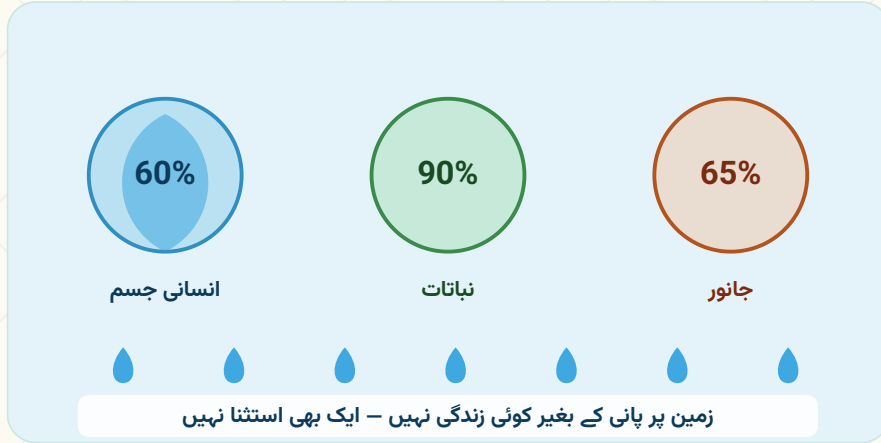
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ کن بات لفظ کا انتخاب ہے۔ اُس زمانے میں بیان کرنے والے کے سامنے دو ہی راستے تھے، تیسرا کوئی نہیں: یا تو کہتا کہ یہ خون ہے، یا کہتا کہ یہ پورے اعضا والا ننھا انسان ہے — اور یہی دو قول تھے جو دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ مگر وہ ایک تیسری بات لایا جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھی: چبایا ہوا لقمہ جس پر دانتوں کے نشان ہیں۔ اور یہ ایسی تعبیر نہیں جو محض لفظی خوبصورتی کے لیے کہی جائے، کیونکہ یہ اُن کے کسی تصور سے مشابہ ہی نہیں تھی — اور اس پر وہی پہنچ سکتا ہے جس نے اسے دیکھا ہو۔ پھر یہ کوئی اکیلا لفظ نہیں جو تنہا کھڑا ہو، بلکہ ایک ترتیب کی کڑی ہے: نطفہ، پھر علقہ، پھر مُضغہ۔ تین عام عربی لفظ، اور ہر ایک وہی بیان کرتا ہے جو خوردبین اُس کے مرحلے میں دکھاتی ہے، اور اُسی ترتیب سے جس ترتیب سے یہ واقعی ہوتا ہے۔ اور ایک حد پر رگ جائیے: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ «مُخَلَّغہ اور غیر مُخَلَّغہ» سے مراد خلیوں کا تمیز پانا اور اُن میں سے بعض کی طے شدہ موت ہے۔ ہم یہاں اس پر کچھ بھی بنیاد نہیں رکھتے: کیونکہ ابن عباس، مجاہد، شعبی اور ابن مسعود سے جو منقول ہے وہ یہ ہے کہ مُخَلَّغہ سے مراد پوری بن چکی ہے اور غیر مُخَلَّغہ سے مراد ساقط ہو جانے والی؛ اور آیت کا سیاق بھی اسی کی تائید کرتا ہے، کیونکہ اس کے بعد آتا ہے: «اور ہم رحموں میں جسے چاہتے ہیں ٹھہرائے رکھتے ہیں»۔ دلیل تنہا «مُضغہ» پر قائم ہے، اور جو بات ثابت نہ ہو اُسے رد کر دینے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا — بلکہ یہی چیز اسے دلیل بناتی ہے۔

ہر زندہ چیز — اصل میں پانی سے

❖ اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔ تو کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے؟ ❖

سورہ الانبیاء — آیت 30



آج تک معلوم ہر زندہ مخلوق کو پانی درکار ہے اور اُس کے بغیر اُس کا قیام نہیں

آسان لفظوں میں

ہر زندہ چیز — انسان ہو، جانور، پودا، یا سب سے چھوٹا جرثومہ — **اصل میں پانی سے ہے**، اور اُس کے بغیر جی نہیں سکتی۔ آپ کا اپنا جسم تقریباً 60% پانی ہے — اور جس دن آپ پیدا ہوئے، تقریباً 78%۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ایک بنجر صحرا میں، جہاں پانی نایاب تھا اور زیادہ تر زمین ریت اور پتھر، سب سے دور کی بات یہ تھی کہ پانی ہر زندہ چیز کی اصل ہو۔ اور فلسفی اشیا کی اصل میں آگ، ہوا، مٹی اور پانی کے درمیان اختلاف کرتے رہے، اور کسی کے پاس فیصلہ کن دلیل نہ تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زندہ خلیہ — جو ساری زندگی کی اکائی ہے — اپنی کمیت کا تقریباً 70% پانی ہے، اور اُسی میں تمام حیاتی تعاملات ہوتے ہیں۔ اور آج تک ایک بھی ایسی زندہ مخلوق معلوم نہیں جو پانی سے بے نیاز ہو۔ اسی لیے خلائی ادارے جب کسی دوسرے سیارے پر زندگی تلاش کرتے ہیں تو سب سے پہلے **پانی** ڈھونڈتے ہیں — اُن کا اعلان کردہ نعرہ ہے: «پانی کے پیچھے چلیے»۔

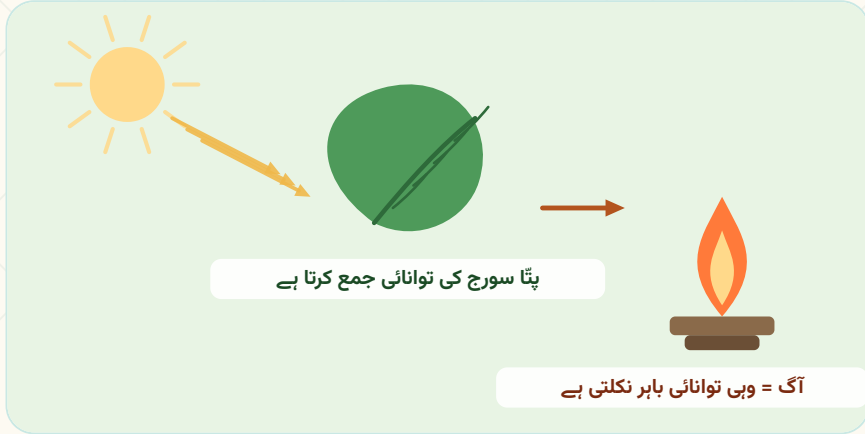
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز لفظ «ہر» میں ہے۔ آیت نے یہ نہیں کہا کہ پانی زندگی کا ایک سبب ہے، نہ یہ کہ اکثر زندہ چیزیں پانی سے ہیں — بلکہ پانی کو بلا استثنا ہر زندہ چیز کی اصل بنایا۔ اور یہ **ایک گلی قاعدہ ہے، اسی لیے قابلِ تکذیب**: صرف ایک ایسی زندہ مخلوق کا پایا جانا کافی ہے جسے پانی کی ضرورت نہ ہو، تو یہ گر جائے۔ اور سائنس نے چودہ صدیوں تک زمین کے ہر ماحول میں تلاش کیا — برف میں، آتش فشانی دراڑوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، اور جوہری بھٹیوں کے اندر — اور ایک استثنا بھی نہ پایا۔

آگ سبز درخت کے اندر محفوظ ہے

❖ وہی جس نے آپ کے لیے سبز درخت سے آگ بنائی، تو دیکھیے آپ اُسی سے سلگاتے ہیں ❖

سورہ یس – آیت 80



درخت سورج کی روشنی اپنے اندر جمع کرتا ہے، اور آگ اُسے دوبارہ چھوڑ دیتی ہے

♀ آسان لفظوں میں

لکڑی میں جو آگ جلتی ہے وہ نئی نہیں – وہ **خود وہی سورج کی روشنی** ہے جسے درخت نے سبز اور زندہ رہتے ہوئے جمع کیا تھا۔ جب آپ لکڑی سلگاتے ہیں تو ایک پرانا قید سورج آزاد کرتے ہیں۔

⌘ اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سبز اور تر ہر عقل میں آگ کی ضد ہے: سبز شاخ نہیں جلتی، خشک جلتی ہے۔ تو آگ کو خاص طور پر «سبز درخت» کی طرف منسوب کرنا روزمرہ مشاہدے کے خلاف لگا۔

🌀 آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ضیائی تالیف: سبز پتہ سورج کے فوٹون پکڑتا ہے اور انہیں کیمیائی توانائی میں بدل دیتا ہے جو شکر اور سیلولوز کے بندھنوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ جلنا بالکل اُلٹا عمل ہے: وہ اُن بندھنوں کو توڑ کر توانائی روشنی اور حرارت بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ ہم جو ایندھن استعمال کرتے ہیں – لکڑی، کوئلہ، تیل اور گیس – وہ سورج کی وہی توانائی ہے جسے سبز پودے نے جمع کیا۔

✦ یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

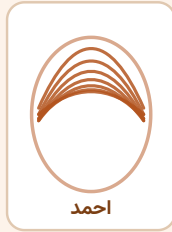
اعجاز تخصیص میں ہے۔ آیت نے «درخت سے آگ» نہیں کہا، بلکہ «سبز درخت سے» کہا – اور سبزی کی حالت ہی ضیائی تالیف اور ذخیرے کی حالت ہے۔ یعنی آگ اُس مرحلے کی طرف منسوب ہے جس میں توانائی **جمع کی جاتی ہے**، نہ اُس مرحلے کی طرف جس میں جلائی جاتی ہے۔ اور خشک لکڑی اُسی سے جلتی ہے جو اُس نے سبز رہتے ہوئے جمع کیا تھا۔ یہ ایک حالت اور نتیجے کے درمیان بالکل درست سببی ربط ہے، جو 1817 میں کلوروفل کی دریافت کے بعد ہی سمجھ میں آیا۔

اُنکلی کے نشان... آپ کی واحد شناخت

کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیاں جمع نہ کریں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اُس کی اُنکلیوں

کے پور بھی درست بنا دینے پر قادر ہیں

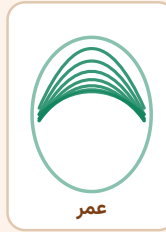
سورہ قیامہ - آیات 3-4



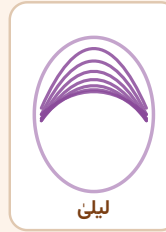
احمد



سارہ



عمر



لین

دو نشان کبھی نہیں ملتے - ہم شکل جڑواں کے بھی نہیں

آٹھ ارب انسان... آٹھ ارب مختلف نشان

آسان لفظوں میں

آپ کی اُنکلیوں کے پوروں پر باریک لکیریں ہیں۔ یہ کسی دوسرے انسان میں کبھی نہیں دہرائی جاتیں - حتیٰ کہ ہم شکل جڑواں بھائی میں بھی نہیں جو ہر طرح آپ جیسا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُنکلیوں کے پور جلد کا ایک عام حصہ تھے؛ نہ کوئی انہیں دیکھتا تھا، نہ کوئی انہیں امتیازی سمجھتا تھا۔ لوگ قدیم زمانے سے مٹی پر اور معاہدوں پر ذاتی مہر کے طور پر اُنکلیاں ثبت کرتے آئے ہیں، مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ منفرد ہیں اور کبھی نہیں دہرائی جاتیں، نہ یہ کہ یہ عمر بھر قائم رہتی ہیں۔ شناخت کے لیے ان کا باقاعدہ استعمال 1892 میں ارجنٹائن میں شروع ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پوروں کی لکیریں حمل کے دسویں ہفتے میں بنتی ہیں، اور جینز اور رحم کے اندر امینوٹک سیال کے دباؤ کے ایک پیچیدہ تعامل سے متعین ہوتی ہیں، اور بالکل منفرد ہو کر سامنے آتی ہیں۔ یہ عمر بھر ثابت رہتی ہیں، نہ بدلتی ہیں نہ مٹتی ہیں، اور اوپری جلد جل جائے تب بھی جوں کی توں لوٹ آتی ہیں۔ اور دنیا بھر کے شناختی نظام انہی پر قائم ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

کلید سیاق ہے۔ آیت مُردوں کے اٹھائے جانے اور ہڈیوں کے جمع کیے جانے کی بات کر رہی ہے۔ اور جب اسے بعید سمجھنے والے کو جواب دیا جاتا ہے تو توقع یہی تھی کہ کہا جائے: کیوں نہیں، ہم اُس کی ہڈیاں جمع کرنے پر قادر ہیں۔ مگر جواب کہیں زیادہ باریک چیز کے ساتھ آیا: «ہم تو اُس کی اُنکلیوں کے پور بھی درست بنا دینے پر قادر ہیں»۔ چنانچہ پورے بدن کے سب حصوں میں سے خاص پوروں کو چُننا، اور وہ بھی اُس مقام پر جہاں بات کسی چیز کو ہو ویسا ہی لوٹا دینے کی قدرت ثابت کرنے کی ہے، اس کا اشارہ ہے کہ یہی انفرادیت اور شناخت کا مقام ہیں۔ اور یہ بارہ صدیوں بعد ہی معلوم ہو سکا۔

پر پھیلائے ہوئے، اور سمیٹے ہوئے

کیا اُنہوں نے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا، پر پھیلائے ہوئے، اور وہ سمیٹے بھی ہیں؟ اُنہیں رحمن

کے سوا کوئی نہیں تھامتا

سورہ ملک – آیت 19



پھیلے ہوئے پر سے تیرنا اور سمیٹے ہوئے پر سے پھڑپھڑانا: زمین کی ہر پرواز انہی دو میں سے ایک ہے

آسان لفظوں میں

پرنده صرف دو طریقوں سے اڑتا ہے: یا تو اپنے دونوں پر پھیلا دیتا ہے اور بغیر حرکت کے ہوا میں بہتا چلا جاتا ہے، یا اُنہیں سمیٹ کر پھڑپھڑاتا ہے تاکہ خود کو دھکیلے۔ اور قرآن نے یہی دونوں ذکر کیے، اور کچھ نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پرواز دیکھی جاتی تھی، اُس کا تجزیہ نہیں ہوتا تھا۔ کوئی پرواز کے دو اندازوں میں فرق نہیں کرتا تھا، نہ جانتا تھا کہ کون سا اُٹھان پیدا کرتا ہے اور کون سا دھکا۔ اور انسان صدیوں تک پھڑپھڑاٹ کی نقل کر کے اُڑنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ایرو ڈائنامکس پرندوں کی پرواز کو دو ہی اندازوں میں بانٹتی ہے، تیسرا کوئی نہیں: **بادبانی تیراؤ** (Gliding/Soaring) – پھیلے ہوئے ساکن پر سے، جو اوپر اُٹھتی ہوا سے کام لیتا ہے – اور **پھڑپھڑاتی پرواز** (Flapping) – پر سمیٹ اور پھیلا کر دھکا پیدا کرنا۔ اور پہلے ہی اصول پر، یعنی پھیلے ہوئے ساکن پر، سارے ہوائی جہاز بنے ہیں۔ انسان اُسی وقت اُڑ سکا جب اُس نے پھڑپھڑاٹ چھوڑ کر پھیلاؤ اپنایا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

پرواز کو دو ہی اندازوں میں محدود کر دینا پہلی باریکی ہے۔ دوسری باریکی **صیغے** میں ہے: «صاَقَات» اسم فاعل کے صیغے میں آیا ہے، جو ثبات اور دوام پر دلالت کرتا ہے، اور «يَقِيضُن» فعل مضارع کے صیغے میں آیا ہے، جو تجدد اور وقفے وقفے سے ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور عین یہی وہ طبیعی فرق ہے: پر کا پھیلانا ایک مسلسل حالت ہے، اور سمیٹنا ایک بار بار دہرائی جانے والی حرکت۔ اور تیسری باریکی: «صاَقَات» کو «يَقِيضُن» پر مقدم کرنا – کیونکہ پھیلا ہوا پر ہی وہ اصل ہے جو اُٹھان کی قوت پیدا کرتا ہے، اور پھڑپھڑانا اُس پر ایک اضافہ ہے۔

اصحابِ کہف کا کروٹ بدلنا... اور بستر کے زخم

اور آپ انہیں جاگتا ہوا سمجھیں گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ اور ہم انہیں دائیں اور بائیں کروٹ دلاتے

تھے

سورہ الکہف – آیت 18



آج ہر ہسپتال میں بستر پر پڑے مریض کی دیکھ بھال کا ضابطہ

آسان لفظوں میں

اصحابِ کہف بہت لمبی مدت سوئے رہے، اور اللہ انہیں دائیں اور بائیں کروٹ دلاتا رہا۔ اور آج طب کہتی ہے: جو مریض بے حرکت پڑا رہے اس کی جلد پر زخم پڑ جاتے ہیں اور گوشت سڑنے لگتا ہے۔ اور اس کا واحد علاج کروٹ بدلنا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کی نظر میں نیند خالص آرام تھی، جتنی بھی لمبی ہو اس میں کوئی نقصان نہیں۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ جسم کا ایک ہی حالت پر ٹھہرے رہنا بافتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ سو ایک لمبی نیند کے قصے میں کروٹ بدلنے کا ذکر ایک بے ضرورت تفصیل لگتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بستر کے زخم (Bedsore / Pressure Ulcers): یہ تب پیدا ہوتے ہیں جب جسم کا وزن ایک ہی مقام پر دباؤ ڈالے اور وہاں خون کی رسائی کٹ جائے، سو خلیے مر جاتے ہیں اور جلد پر زخم پڑتا ہے، پھر پٹھے پر، پھر ہڈی پر۔ اور بگاڑ مکمل بے حرکتی کے **صرف دو گھنٹے** کے اندر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دیر تک بستر پر پڑے رہنے کی سب سے خطرناک پیچیدگیوں میں سے ہے اور جان لے سکتا ہے۔ اور عالمی منظور شدہ بچاؤ یہ ہے: **مریض کو دائیں اور بائیں کروٹ دلوائیے**۔ ہر دو سے تین گھنٹے بعد، اس کی حالت کے مطابق۔

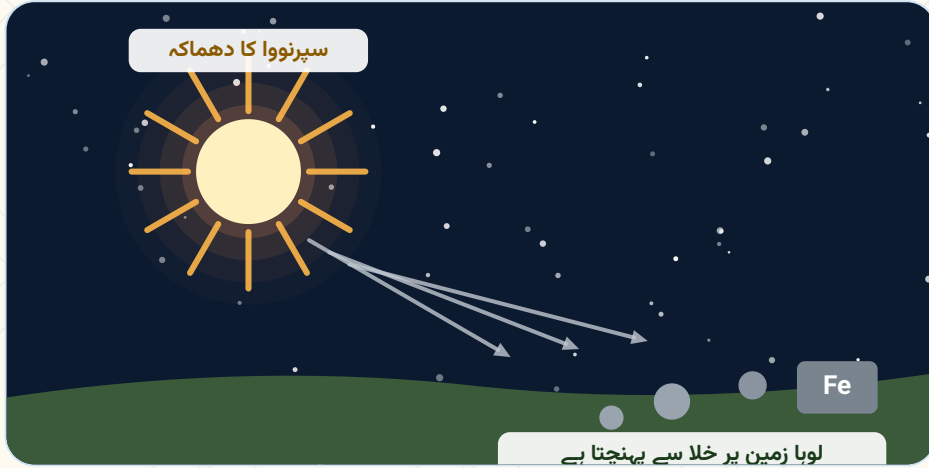
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ آیت نے کروٹ بدلنے کا ذکر نہ بے کار کیا ہے اور نہ قصے کی زینت کے طور پر۔ بلکہ یہ اس بیان کے سیاق میں آیا کہ **ان کے جسم اُس لمبی مدت میں کیسے محفوظ رکھے گئے**۔ اور یہ اس علم کا تقاضا کرتا ہے کہ ساکن جسم خراب ہو جاتا ہے، اور یہ کہ **کروٹ بدلنا ہی اس کا علاج ہے**۔ اور لفظ میں باریکی اور بھی بڑھ جاتی ہے: «دائیں اور بائیں»۔ اور یہ بعینہ وہی پہلو کے بل لٹانے کی وضع ہے جس کی طب سفارش کرتی ہے (تیس درجے کی وضع)، کیونکہ یہ دباؤ کو سرین اور کولھے سے اٹھا دیتی ہے، اور یہ دونوں سب سے خطرناک مقامات میں سے ہیں (اور ایڑیوں کے لیے ایک خاص سہارا ہوتا ہے جو انہیں بستر سے اوپر اٹھائے رکھتا ہے)۔ پھر اسی آیت میں ایک اور تفصیل: «اور ان کا کتا چوکھٹ پر اپنے دونوں بازو پھیلانے ہوئے تھا»۔ اور بازوؤں کا پھیلانا آرام کی وضع ہے، پھرے کی نہیں، اور کتا یہی کرتا ہے جب اس کا لیٹنا لمبا ہو جائے۔

لوہا... اتارا گیا، یہاں بنا نہیں

اور ہم نے لوہا اتارا، جس میں سخت زور ہے اور لوگوں کے لیے فائدے۔

سورہ حدید - آیت 25



زمین کے لوہے کا ہر ذرہ - اور آپ کے خون کا بھی - کسی ستارے کے اندر پیدا ہوا

آسان لفظوں میں

زمین کا سارا لوہا، حتیٰ کہ وہ لوہا بھی جو آپ کے خون میں ہے، یہاں نہیں بنا۔ یہ **خلا میں دیو ہیکل ستاروں کے پھٹنے** سے آیا، پھر زمین پر گرا۔ اور قرآن نے یہ نہیں کہا کہ «ہم نے لوہا پیدا کیا»، کہا: «**ہم نے اتارا**»۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک دھاتیں زمین کے پیٹ سے نکالی جاتی تھیں، سو وہ زمین ہی سے تھیں اور اُسی کی جنس سے۔ اور یہ تصوّر سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ کوئی خاص دھات **اِس سیارے کے باہر سے آئی ہو**۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ستاروں کے اندر کا جوہری ادغام عناصر کو لوہے تک بناتا ہے - پھر وہیں رُک جاتا ہے، کیونکہ لوہا جوہری قوّتِ ربط کی چوٹی ہے: اُس سے ہلکی چیزوں کا ادغام توانائی دیتا ہے، اور اُس سے بھاری چیزوں کا **بنا توانائی کھاتا ہے، دیتا نہیں**۔ سو کوئی عام ستارہ اُس سے بھاری چیز نہیں بنا سکتا۔ صرف سپرنووا (Supernova) کے دھماکے ہی لوہے کو خلا میں پھینکتے ہیں۔ اور ہمارا سیارہ اور اُس کا سارا لوہا ستاروں کے اِسی غبار سے جمع ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قرآن نے «انزال» (اتارنے) کا فعل خاص طور پر لوہے کے ساتھ استعمال کیا، ایک ایسے سیاق میں جو رسولوں کے بھیجنے اور کتابوں کے اتارنے کی بات کر رہا ہے - یعنی اُس چیز کے سیاق میں جو **اوپر سے آتی ہے**۔ اور یہی، لفظ بہ لفظ، طبیعی حقیقت ہے۔ اِس پر یہ بھی بڑھا لیجیے کہ لوہے کا جوہری عدد 26 ہے اور کمیتی عدد 56، اور سورہ حدید مصحف کی 57ویں سورت ہے، اور رائج شمار میں یہ آیت 25 ہے۔ مگر سب سے مضبوط دلیل ایک ہی لفظ رہتا ہے: «**ہم نے اتارا**»۔

دودھ پلانے کے دو مکمل سال

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اُس کے لیے جو دودھ پلانے کی مدت

پوری کرنا چاہے

سورہ بقرہ - آیت 233

قرآن - 1400 سال پہلے

24 مہینے

«پورے دو سال»

جو پورا کرنا چاہے

عالمی ادارہ صحت

24 مہینے

«دو سال یا زیادہ»

عالمی سطح پر مسلمہ سفارش

وہی عدد... چودہ صدیوں کے فرق سے

عالمی ادارہ صحت کی سفارش مدت اور اصول دونوں میں آیت سے مطابقت رکھتی ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے مکمل رضاعت کی مدت **پورے دو سال** مقرر کی۔ اور آج عالمی ادارہ صحت بالکل یہی مدت تجویز کرتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دودھ پلانے کی مدت قوموں کے درمیان رواج اور حالات کے مطابق بہت مختلف تھی - چند مہینوں سے لے کر کئی برسوں تک - اور اس کی کوئی سائنسی بنیاد نہ تھی۔ بچے کی نشوونما اور اُس کی قوتِ مدافعت کے لیے مثالی مدت جاننے کا کوئی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عالمی ادارہ صحت اور یونیسف **چھ ماہ تک صرف ماں کا دودھ** پلانے کی سفارش کرتے ہیں، پھر اُس کے ساتھ ضمنی غذا شامل کر کے **دو سال یا اُس سے زیادہ تک** جاری رکھنے کی۔ اور ثابت ہو چکا ہے کہ ماں کا دودھ ایسے اینٹی باڈیز منتقل کرتا ہے جو بچے کی قوتِ مدافعت بناتے ہیں، شیرخوار بچوں کی اموات، انفیکشن اور ذیابیطس کم کرتا ہے، اور بہتر ذہنی نشوونما سے جڑا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

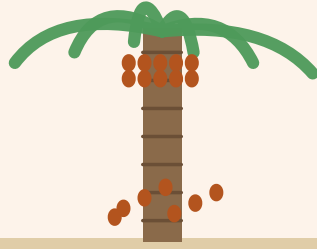
باریکی صرف عدد میں نہیں، بلکہ **اُس کے ساتھ لگی ہوئی قید** میں ہے: «اُس کے لیے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے»۔ آیت نے دو سال کو کوئی جامد فریضہ نہیں بنایا، بلکہ اُنہیں **پوری کرنے کی مستحب حد** قرار دیا - اور جدید طبی سفارش کی تعبیر عین یہی ہے («دو سال یا اُس سے زیادہ»، نہ کہ «دو سال لازماً»)۔ پھر آیت نے لچک میں مزید اضافہ کیا: والدین کی باہمی رضامندی اور مشورے سے جلد دودھ چھڑانے کی اجازت دی، اور کسی دوسری دودھ پلانے والی سے دودھ پلوانے کی اجازت دی۔ چنانچہ یہ عدد میں بھی طب سے متفق ہے اور سفارش کی روح میں بھی۔

کھجور کا تنا اپنی طرف ہلائیے

اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلائیے، آپ پر تازہ پکی کھجوریں گریں گی۔ پس کھائیے اور

پیجیے اور آنکھیں ٹھنڈی کیجیے

سورہ مریم – آیات 25-26



جننے والی عورت کے لیے بہترین ممکن غذا

زچہ کے لیے تازہ کھجور میں کیا ہے

- تیز شکر جو توانائی لوٹا دے
- آکسی ٹوسن: رحم کو سکڑاتا ہے
- ولادت کے بعد خون بہنا کم کرے
- فولاد، پوٹاشیم اور میگنیشیم
- ریشے جو قبض روکتے ہیں

کھجور آج بھی حمل کے آخری ہفتوں میں اور زچگی کے بعد تجویز کی جاتی ہے

آسان لفظوں میں

ایک عورت کھجور کے نیچے تنہا بچہ جن رہی ہے، اور اُس سے کہا جاتا ہے: **تازہ کھجوریں کھائیے**۔ اور طب آج کہتی ہے کہ کھجور اُن بہترین چیزوں میں سے ہے جو عورت زچگی کے وقت اور بعد کھا سکتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تازہ کھجور ایک جانی پہچانی اور بہت پسندیدہ غذا تھی، مگر زچگی میں اُس کا کوئی متعین طبی اثر معلوم نہ تھا۔ زچہ کے لیے معمول کا مشورہ آرام، گرمی اور شوربا تھا۔ اور ٹھیک اُسی لمحے ایک خاص پھل کو چُن لینا ایک نمایاں تعین ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مجلوں میں شائع شدہ مطالعات نے ثابت کیا ہے کہ حمل کے آخری ہفتوں میں کھجور کھانا **درد زہ کی مدت گھٹاتا ہے اور زچگی مصنوعی طور پر شروع کرانے کی ضرورت کم کرتا ہے**۔ کھجور میں فریکٹوز اور گلوکوز کی شکر بکثرت ہے جو تیزی سے جذب ہوتی ہے۔ اور ماں کو طاقت خرچ کر دینے کے بعد اُسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز پوٹاشیم، فولاد اور میگنیشیم۔ اور اِس میں **آکسی ٹوسن** کا کام کرنے والے مرکبات ہیں، جو رحم کو سکڑنے میں مدد دیتے اور خون بہنا کم کرتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اِس معاملے میں تین باتوں پر غور کیجیے۔ پہلی: پھل کا تعین – خاص کھجور، کوئی اور نہیں، اور یہی اِس حالت کے لیے ممکنہ بہترین غذا ہے۔ دوسری: حالت کا تعین – **«تازہ پکی کھجوریں»**، یعنی نرم اور تر کھجور، خشک نہیں؛ اور یہی جلد جذب ہوتی اور آسانی سے ہضم ہوتی ہے۔ تیسری، اور یہی سب سے عجیب ہے: **تنے کو ہلانے** کا حکم – یعنی سب سے زیادہ کمزوری کے لمحے میں عورت کو حرکت اور محنت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور جدید طب درد زہ کے دوران حرکت کی سفارش کرتی ہے، کیونکہ اِس سے زچگی جلد ہوتی ہے۔ غذا، حرکت اور دل کا سکون («اور آنکھیں ٹھنڈی کیجیے») – ایک مکمل ضابطہ علاج۔

بہتا خون اور سؤر کا گوشت کیوں حرام ہوئے؟

کہہ دیجیے: جو وحی میرے پاس آئی ہے اُس میں کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اِس کے کہ وہ مُردار ہو، یا بہایا ہوا خون، یا سؤر کا گوشت — کہ یہ ناپاک ہے

سورہ انعام — آیت 145

بہتا خون  نمو کا مثالی ماحول بیکٹیریا کے لیے اور فاسد مادہ ڈھوتا ہے	سؤر کا گوشت  ٹرائکینیلا کیڑا اور فیتہ نما کیڑا اور ٹاکسوپلازما اور سیر شدہ چکنائی	مُردار  بیماری یا زہر سے مرا اور خون اسی میں بند پس جلد سڑ جاتا ہے
---	---	---

تین حرام چیزیں... اور تین وجوہ جو طب نے صدیوں بعد ثابت کیں

حرمت، اپنی وجہ کے معلوم ہونے سے چودہ صدیاں پہلے آگئی

آسان لفظوں میں

قرآن نے تین چیزیں حرام کیں: بہتا ہوا خون، سؤر کا گوشت، اور وہ جانور جو خود مر گیا ہو۔ اور سائنس آج بتاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک **بیماریوں کا معروف ناقل** ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

غذا کا انتخاب رواج، ذوق اور دستیابی سے ہوتا تھا۔ نہ طفیلیوں کا علم تھا، نہ جراثیم کا، نہ اِس کا کہ بیماریاں جانور سے انسان تک منتقل ہوتی ہیں۔ اور سؤر زمین کی بیشتر تہذیبوں میں بلا تامل کھایا جاتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

خون جراثیم کے پھلنے کا مثالی ماحول ہے، اور گردوں کی طرف جانے والا فاسد مادہ، ہارمون اور زہریلے اجزا ساتھ لیے ہوتا ہے۔ **سؤر کا گوشت** ٹرائکینیلا کیڑے کا بڑا ناقل ہے، جو پٹھوں میں گوشہ بنا کر بیٹھتا اور ہلکی پکائی سے نہیں مرتا؛ نیز فیتہ نما کیڑے کا، جس کے لاروے دماغ تک پہنچ سکتے ہیں؛ اور ٹاکسوپلازما کا — نیز اِس میں سیر شدہ چکنائی بھی زیادہ ہے۔ **مُردار** شاید کسی بیماری یا زہر سے مرا ہو، اور اُس کا خون بافتوں ہی میں بند رہ جاتا ہے، اِس لیے جلد سڑ جاتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

باریک قید «**بہایا ہوا**» ہے۔ حرمت ہر خون پر نہیں آئی، بلکہ اُس بہتے ہوئے خون پر جو ذبح کے وقت نکلتا ہے۔ رہا وہ جو بافتوں میں رچا بسا رہ جاتا ہے — یعنی مایوگلوبن — تو وہ معاف ہے، اور اُسے نکالنے کی سرے سے کوئی صورت بھی نہیں۔ چنانچہ یہ حرمت **ایسی سائنسی باریکی کے ساتھ مقرر ہے جو نہ کم رہتی ہے نہ حد سے بڑھتی ہے**۔ اور یہی حال ذبح کا ہے: اِس میں شرط رکھی گئی کہ رگیں کاٹی جائیں تاکہ سارا خون بہہ جائے — اور آج گوشت کی حفاظت کے معیارات اِسی کی سفارش کرتے ہیں، تاکہ جراثیم کا بوجھ کم ہو۔ ایک مکمل شریعت، جو ایسے علم سے ہم آہنگ ہے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

چیونٹی بولی اور خبردار کیا

یہاں تک کہ جب وہ وادیِ نمل پر پہنچے تو چیونٹی بولی: اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ،

کہیں سلیمان اور اُس کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے

سورہ نمل – آیت 18



ایک چیونٹی اپنی بستی کو خبردار کرتی ہے اور ساری بستی بلوں میں سمٹ جاتی ہے

آسان لفظوں میں

چیونٹی نے لشکر آتا دیکھا اور چیونٹیوں کو خبردار کیا کہ گھروں میں چلی جائیں۔ اور سائنس کہتی ہے: چیونٹیاں واقعی خطرے کا پیغام بھیجتی ہیں، اور ساری بستی فوراً جواب دیتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم تصور میں جانور ایک گونگی مخلوق تھی، جس کی نہ کوئی زبان تھی نہ کوئی نظم۔ اور یہ کہ ایک چیونٹی سے ایسا جملہ نکلے جس میں پکار، حکم، تنبیہ، وجہ اور حملہ آور کے لیے عذر سب موجود ہوں («اور اُنہیں خبر بھی نہ ہو») – سننے والے کو یہ ایک علامتی کہانی لگتی تھی، کوئی واقعی خبر نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

چیونٹیاں زمین کی منظم ترین سماجی مخلوقات ہیں، اور وہ تین ثابت شدہ طریقوں سے رابطہ کرتی ہیں: **کیمیائی فیرومون** – ہر پیغام کے لیے الگ مادہ ہے، اور انہی میں خطرے کا فیرومون ہے جو پھیلتا ہے تو ساری بستی چند سیکنڈ میں جواب دیتی ہے؛ **ٹھونگ اور ارتعاش**؛ اور **آواز** – دریافت ہوا کہ چیونٹی میں ایک عضو ہوتا ہے جسے سٹریڈیولیٹری عضو (Stridulatory organ) کہتے ہیں، جو متعین معنی والی آوازیں نکالتا ہے، اور اُنہیں لیبارٹری میں ریکارڈ کر کے پرکھا جا چکا ہے۔

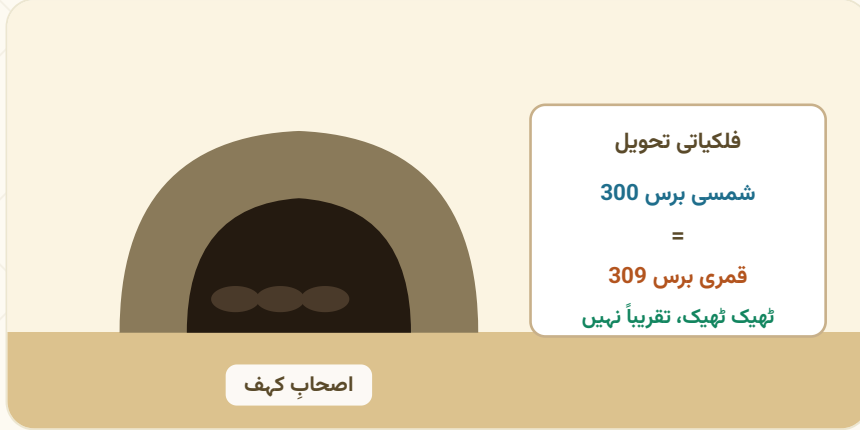
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی دلیل ہیں۔ پہلی: فعل «قالت» مؤنث کے صیغے میں آیا – اور وہ کارکن چیونٹیاں جو باہر نکلتی، پہرہ دیتی اور خبردار کرتی ہیں **سب کی سب مادہ ہیں**، جبکہ نروں کا افزائش کے سوا کوئی کام نہیں، پھر وہ مر جاتے ہیں۔ دوسری: «اپنے گھروں» میں داخل ہونے کا حکم – اور چیونٹیوں کے بل واقعی گھر ہیں، جو کمروں، سرنگوں اور گوداموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسری: «کہیں وہ تمہیں کچل نہ ڈالیں» – عربی کا یہ لفظ توڑنے کے معنی میں ہے، اور چیونٹی کا جسم ایک سخت بیرونی ڈھانچہ ہے جو ٹوٹتا ہے، پچکتا نہیں۔ ایک ہی آیت میں تین باریکیاں۔

تین سو برس، اور نو مزید

اور وہ اپنے غار میں تین سو برس رہے، اور نو اور بڑھ گئے

سورہ کہف – آیت 25



تین صدیوں پر دونوں تقویموں کا فرق صحیح گنتی میں ٹھیک نو برس بنتا ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے کہا کہ وہ **تین سو برس** رہے، پھر بڑھایا: «**اور نو اور بڑھ گئے**»۔ اور سبب نہایت لطیف ہے: تین سو شمسی برس 309.2 قمری برس کے برابر ہیں – یعنی صحیح گنتی میں تین سو نو۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگ ہر علاقے میں ایک ہی تقویم استعمال کرتے تھے، اور دو تقویموں کے درمیان تبدیلی نہیں کرتے تھے۔ اور ایک گول عدد کے بعد «نو» کا اضافہ ایک عجیب اور بے معنی زیادتی لگتا تھا، یہاں تک کہ بعض پڑھنے والوں نے اسے عدد میں تردد سمجھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شمسی سال 365.2422 دن کا ہے، اور قمری سال 354.367 دن کا۔ تو تین سو شمسی برس = 109572.6 دن ہوئے۔ اور اگر اسے قمری سال کی لمبائی پر تقسیم کیا جائے تو **309.2** قمری برس نکلتے ہیں۔ یعنی فرق صحیح گنتی میں نو برس ہے۔ اور اصحابِ کہف ایک رومی ماحول میں تھے جو شمسی تقویم استعمال کرتا تھا، جبکہ قرآن ایسے لوگوں سے خطاب کرتا ہے جو قمری تقویم استعمال کرتے ہیں – سو اس نے عدد دونوں تقویموں میں ایک ساتھ دے دیا۔

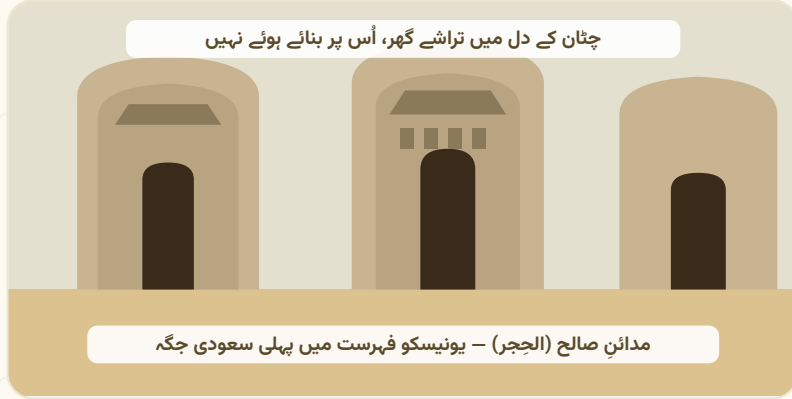
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اگر عدد یونہی بے قاعدہ ہوتا تو «تین سو برس» کہہ کر رک جاتا، یا «تین سو اور کچھ» کہہ دیتا۔ لیکن اضافہ ٹھیک نو کے ساتھ متعین آیا – اور وہی بعینہ فلکی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اور صیغے پر غور کیجیے: «تین سو برس اور نو اور بڑھ گئے» – فعل «بڑھ گئے» بتاتا ہے کہ یہ نو کوئی اور مدت نہیں جو انہوں نے گزاری ہو، بلکہ گنتی میں اضافہ ہے، زمانے میں نہیں – یعنی زمانہ ایک ہی ہے اور عدد تقویم کے بدلنے سے بدل گیا۔ اور یہی واحد تفسیر ہے جو حساب اور زبان، دونوں کے اعتبار سے درست بیٹھتی ہے۔

ثمود، جنہوں نے پہاڑ تراش کر گھر بنائے

اور تم پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو، بڑی مہارت سے ﴿يَبْنِي﴾ ... ﴿يَبْنِي﴾ اور وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے، بے خوف ہو کر

سورہ شعراء 149 – اور سورہ حجر 82



چٹان کے دل میں تراشے گھر، اُس پر بنائے ہوئے نہیں

مدائن صالح (الحجر) – یونیسکو فہرست میں پہلی سعودی جگہ

چٹان کے اوپر سے نیچے تک تراشے گئے بہت بڑے رخ – ایک بھی غلطی برداشت نہیں کرتے

آسان لفظوں میں

قرآن نے کہا کہ قوم ثمود اپنے گھر پہاڑوں کے اندر تراشتے تھے – پتھر سے بناتے نہیں تھے، بلکہ خود پہاڑ کو کھود کر اُسی سے گھر بناتے تھے۔ اور یہ گھر آج بھی موجود ہیں اور زائرین انہیں دیکھتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرہ عرب میں معروف تعمیر مٹی، پتھر اور کھجور کی شاخوں کی تھی۔ اور ایک پوری تہذیب کا اپنے مسکن پہاڑوں کے پیٹ میں تراشنا سننے والوں کے لیے اجنبی بات تھی۔ اور قرآن نے ایک ایسی متعین قوم کا نام لیا جس کا تورات میں کوئی ذکر نہیں، اور جسے قدیم مصادر – سرگون کے سالناموں سے لے کر دیودورس اور بطليموس تک – شمالی جزیرہ عرب کے ایک عربی قبیلے کے نام کے سوا نہیں جانتے تھے، اور کسی نے اُس کی طرف یہ تعمیری تکنیک منسوب نہیں کی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مدائن صالح (الحجر)، شمالی سعودی عرب کے الغلا میں: ریتلی چٹان میں تراشے گئے 130 سے زیادہ رخ، جن میں سے کچھ بیس میٹر سے اونچے ہیں، ستونوں، تاجوں، کنگروں اور ثمودی و نبطی نقوش کے ساتھ۔ اور یہ 2008 میں یونیسکو کی عالمی ورثہ فہرست میں پہلی سعودی جگہ کے طور پر درج ہوا۔ اور یہ مقام قرآن میں اپنے نام کے ساتھ مذکور ہے: «اور بے شک حجر والوں نے رسولوں کو جھٹلایا»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ کن وہ فعل ہے جو استعمال ہوا: «تراشتے ہیں»، نہ کہ «بناتے ہیں»۔ اور عربی میں «نحت» ٹھوس چٹان میں سے مادہ نکالنا ہے، اور یہ تعمیر کے بالکل الٹ ہے۔ پھر تخصیص: «پہاڑوں میں سے» – یعنی خود پہاڑ ہی گھر کا مادہ ہے۔ اور یہ ایک ایسی تکنیک کا باریک بیان ہے جو سننے والوں کے گرد کسی چیز سے مشابہ نہ تھی۔ اور ایک نہایت بامعنی نفسیاتی وصف بھی بڑھایا: «بے خوف» – کہ یہ گھر نہ گرتے ہیں، نہ جلتے ہیں، نہ کوئی دشمن انہیں ڈھا سکتا ہے، کیونکہ وہ خود چٹان ہیں۔ اور اسی سے آیت کا مفہوم اور تیز ہو جاتا ہے: سب سے بڑی تعمیری حفاظت اُن کے کچھ کام نہ آئی۔

اصحابِ اُخدود... اُگ کی خندق کھودنے والے

ہلاک کیے گئے خندق والے اُگ اُگ والے جس میں خوب ایندھن تھا جب وہ اُس کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ مومنوں کے ساتھ کر رہے تھے اُس پر گواہ تھے

سورہ بروج – آیات 4-7



ایک تاریخی قتل عام جو یمنی کتبوں میں اور اُسی زمانے کے سریانی خطوط میں درج ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے ایسی قوم کا ذکر کیا جس نے **ایک لمبی خندق** کھودی اور اُس میں آگ جلائی، پھر مومنوں کو اُس میں ڈالا اور بیٹھ کر دیکھتے رہے۔ اور یہ حقیقی تاریخی واقعہ ہے جو پتھر کے کتبوں میں درج ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ واقعہ عربوں کی کتابوں میں کسی قابلِ اعتماد تفصیل کے ساتھ مذکور نہ تھا، نہ مکہ میں اُس کی کوئی لکھی ہوئی سند دستیاب تھی۔ اور یہ ایک دوسری اُمت، پہلے زمانے اور دور کی سرزمین کا قصہ ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

تاریخ تقریباً 523 عیسوی کے **نجران** کے قتل عام کو ثابت کرتی ہے، جب جمہیری بادشاہ **دُو نواس** نے نجران کے نصاریٰ پر ظلم کیا اور جس نے اپنے دین سے پھرنے سے انکار کیا اُسے جلا دیا۔ اور یہ واقعہ ان میں درج ہے: **حصنِ غُراب کا کتبہ**، اور واقعے کے ہم عصر **شمعون الارشامی کا سریانی خط**، اور بازنطینی و حبشی مصادر۔ اور نجران کے شمال میں بئرِ جمیٰ میں 633 جمہیری سن کے تین کتبے دریافت ہوئے، جو مقتولوں کو بارہ ہزار اور چودہ ہزار کے درمیان، اور قیدیوں کو ساڑھے نو ہزار اور گیارہ ہزار کے درمیان شمار کرتے ہیں۔

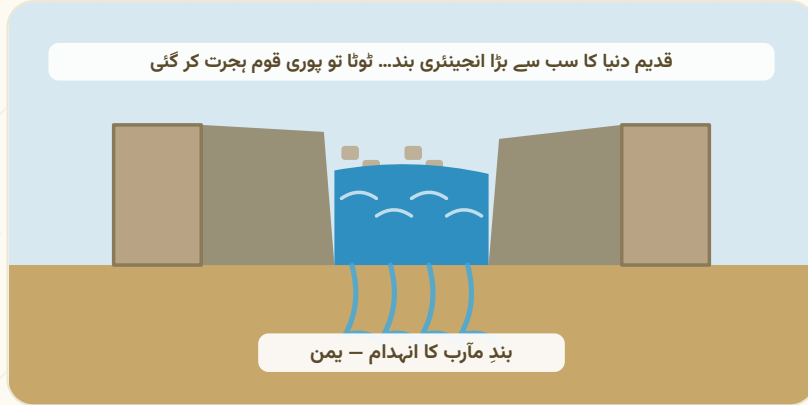
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ چھوٹی تفصیلات کی باریکی کرتی ہے۔ عربی میں «اُخدود» زمین میں لمبا سیدھا شگاف ہے – گول گڑھا نہیں۔ اور یہ کھودی ہوئی خندقوں کے وصف کے عین مطابق ہے۔ اور «جس میں خوب ایندھن تھا» یہ بتاتا ہے کہ اُس آگ کو تازہ ایندھن پہنچایا جاتا رہا، وہ کوئی اتفاقی آگ نہ تھی۔ اور «اُس کے کنارے بیٹھے ہوئے» اور «گواہ»: یعنی مجرم بیٹھ کر دیکھ رہے تھے – اور یہ ایسی تفصیل ہے جو شمعون کے خط میں آنے والی اس بات کے عین مطابق ہے کہ بادشاہ خود سزا کے نفاذ میں حاضر تھا۔ اور غور کیجیے کہ قرآن نے نہ بادشاہ کا نام لیا نہ قوم کا – کیونکہ مقصود عبرت ہے، قصہ گوئی نہیں۔

پھر انہوں نے منہ موڑ لیا تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا، اور ہم نے ان کے دو باغوں کے

بدلے دو ایسے باغ دے دیے جن میں بدمزہ پھل اور جھاؤ تھا

سورہ سبا - آیت 16



اس دیوبیکل بند کے آثار آج بھی مآرب میں قائم ہیں

آسان لفظوں میں

یمن میں ایک مالدار سلطنت تھی جس کا نام **سبا** تھا، جو ایک عظیم بند کے سہارے جیتی تھی جو اس کے باغ سیراب کرتا تھا۔ پھر بند ٹوٹ گیا، اور سیلاب ہر چیز بہا لے گیا، اور باغ ایسے کڑوے درختوں میں بدل گئے جو کھائے نہیں جاتے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سبا عربوں کی یادداشت میں شعر اور ضرب المثل کا ایک نام تھا - «تفرقوا ایدی سبا»۔ لیکن نہ کوئی کھدے ہوئے آثار تھے اور نہ پڑھے جانے والے کتبے۔ اور مغربی مؤرخین تو اس سلطنت کے سرے سے وجود ہی میں شک کرتے تھے اور اسے آدھی داستان شمار کرتے تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بند مآرب آج ایک قائم نشانی ہے: تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں بنا، لمبائی تقریباً 600 میٹر، اور تقریباً دس ہزار ہیکٹر زمین کو سیراب کرتا تھا۔ اور اس کے ٹوٹنے کے واقعات **سبائی مسند کتبوں** میں درج ہیں جو اسی مقام سے ملے ہیں - انہی میں ابراہ کا وہ مشہور کتبہ ہے جو 548ء میں بند کی مرمت بیان کرتا ہے۔ اور آخری انہدام تقریباً 570-580ء میں ہوا، جس سے **پورے پورے یمنی قبیلوں کی ہجرت** شمال کی طرف ہوئی - اور یہ ہجرت عربوں کے انساب اور تاریخ میں معروف ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

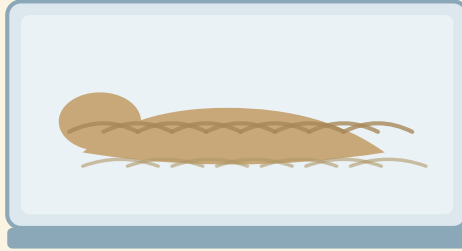
آیت نے صرف انہدام کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد زمین کے ساتھ جو کچھ ہوا، اسے نباتاتی باریکی کے ساتھ بیان کیا: «دو باغ جن میں بدمزہ پھل اور جھاؤ اور کچھ تھوڑی سی بیریاں»۔ اور خمت کانٹے دار کڑوا درخت ہے، اور اٹل جھاؤ کی ایک قسم، اور سدر بیری کا درخت - اور بالکل یہی خشک نمکین ماحول کے پودے ہیں جو آبپاشی رک جانے اور مٹی کے کھاری ہو جانے پر کھیتی کی جگہ لے لیتے ہیں۔ پھر فرمایا: «اور کچھ تھوڑی سی بیریاں» - ٹھیک اپنے مقام پر تقلیل، کیونکہ بیری ان تینوں میں سب سے زیادہ نفع بخش اور سب سے کم ہے۔

فرعون کا بدن... نشانی بننے کو محفوظ

سو آج ہم تجھے تیرے بدن کے ساتھ بچا لیں گے، تاکہ تُو اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی بنے

سورہ یونس - آیت 92

تین ہزار سال سے زیادہ پرانی لاش... آج بھی موجود



قابرہ کا عجائب گھر - شاہی ممیوں کا ہال

فرعون کا جسم آج شیشے کے پیچھے رکھا ہے، جہاں لوگ اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں

آسان لفظوں میں

جب فرعون سمندر میں غرق ہوا تو اللہ نے فرمایا کہ وہ اُس کا **جسم** محفوظ رکھے گا تاکہ بعد میں آنے والے اُسے دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ اور وہ جسم آج ایک عجائب گھر میں موجود ہے جسے ساری دنیا کے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جو سمندر میں ڈوبتا ہے اُس کا جسم چلا جاتا ہے: مچھلیاں کھا جاتی ہیں، یا گل سڑ جاتا ہے، یا ریت میں گم ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ آیت اُتری تو عربوں میں سے کوئی شاہی حنوط کاری کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا، نہ فراعنہ کی قبروں کا۔ بلکہ خود بیروغلیفی زبان بالکل بھلا دی گئی تھی، اور اُس کے رموز 1822 سے پہلے حل نہ ہوئے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شاہی ممیوں کا ذخیرہ 1881 میں دیر البحری میں دریافت ہوا، پھر 1898 میں امنحتب دوم کی قبر، تو مملکتِ جدیدہ کے فراعنہ کے جسم سامنے آئے۔ اور **مرنپتاح** کا جسم - جو خروج کے فرعون کے اُمیدواروں میں سے ایک ہے، اگرچہ اکثر محققین رعمسیس دوم کے قائل ہیں - قابرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اور ماہر تشریح گرافٹن ایلیٹ سمتھ نے 1907 میں اُس کے کفن کھولے اور ایک بوڑھے آدمی کے جسم کا بیان کیا جو حنوط کاری سے پورا کا پورا محفوظ رہا - اور وہ آج شیشے کے پیچھے رکھا ہے، جہاں زائرین اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

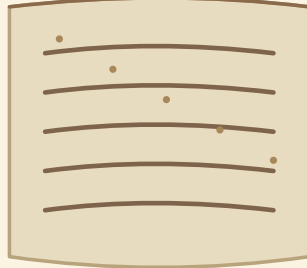
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے صرف «ہم تجھے بچا لیں گے» نہیں کہا، بلکہ خاص کیا: «**تیرے بدن کے ساتھ**» - یعنی روح کے بغیر صرف جسم۔ اور یہ ایک باریک امتیاز ہے جو کسی شخص کے بچنے اور اُس کی لاش کے باقی رہ جانے میں فرق کرتا ہے۔ پھر اس کی علت بتائی: «**تاکہ تُو اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی بنے**» - یعنی خود جسم کا باقی رہنا ہی مقصود ہے، وہ دیکھے جانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک ایسے صحرا میں اُتری جس کے باشندوں کو نہ ممیوں کا علم تھا نہ قبروں کا، اور اُن قبروں کے کھلنے اور اُن کے مکینوں کے شیشے کے بالوں میں رکھے جانے سے بارہ سو سال پہلے۔

وہ مخطوطات جن کی گواہی کاربن نے دی

❖ شک ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے، اور یہ شک ہم ہی اس کے نگہبان ہیں ❖

سورہ حجر – آیت 9



برمنگھم یونیورسٹی – برطانیہ

مخطوطہ برمنگھم

کاربن 14 سے تاریخ کاری

645 – 568ء

احتمال کے ساتھ 95%

اس کا متن آج کے مصحف کے مطابق ہے

نبی ﷺ کی زندگی کا، یا اس کے فوراً بعد کا چمڑے کا ایک ورق – اور اس کا متن آج ہی کا متن ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے یہ ذمہ لیا کہ وہ محفوظ رہے گا، بدلے گا نہیں۔ اور آج ہمارے پاس **تابکار کاربن سے تاریخ شدہ مخطوطات** ہیں جو تقریباً نبی ﷺ کے زمانے تک پہنچتے ہیں – اور ان کا متن وہی ہے جو اس مصحف کا ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے، حرف بہ حرف۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تمام قدیم کتابیں نقل اور ترجمے کے دوران کمی، زیادتی اور تبدیلی کا شکار ہوتی ہیں۔ اور یہ ہر اس متن کا فطری انجام ہے جو صدیوں ہاتھ سے منتقل ہوتا رہے۔ چنانچہ کامل حفاظت کا دعویٰ ایسا دعویٰ تھا جسے کوئی ایک بھی مختلف مخطوطہ جھٹلا سکتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مخطوطہ برمنگھم: چمڑے کا ایک ورق جس کی جانچ 2015 میں جامعہ آکسفورڈ میں کاربن 14 سے کی گئی، تو اس کی تاریخ **568 اور 645ء** کے درمیان نکلی، 95% احتمال کے ساتھ۔ اور مخطوطہ صنعا (اس کا بالائی عثمانی متن)، اور مخطوطہ توبنگن، اور مخطوطہ سمرقند، اور استنبول اور قاہرہ کے بڑے مصاحف۔ اور محققین نے – مسلمان اور غیر مسلم دونوں – ان مخطوطات کا آج رائج مصحف سے موازنہ کیا، تو متن میں مطابقت تقریباً کامل تھی، سوائے حروف کی رسم میں املا کے چند فرق کے، جو نہ لفظ بدلتے ہیں نہ معنی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حفاظت اکیلے مخطوطات پر قائم نہیں رہی، بلکہ ایک ایسے دوبارے نظام پر جو انسانی تاریخ میں بے مثال ہے: چہاں پھٹک کے ساتھ کتابت، اور **تواتر کے ساتھ سینوں میں حفظ**۔ اور ہر نسل میں اسے لاکھوں لوگ دور دراز ملکوں میں یاد کیے ہوئے ہوتے ہیں، جنہیں کوئی ایک حکومت جمع نہیں کرتی، سو یہ عملاً ناممکن ہے کہ وہ ایک حرف بدلنے پر متفق ہو جائیں۔ اور خود متن نے یہ ذمہ اس وقت اعلان کیا جب وہ سب سے کمزور حال میں تھا – مکہ میں ایک ستائی ہوئی جماعت۔ کسی متن کا چودہ صدیاں اس طرح قائم رہنا کہ دو مختلف نسخے تک نہ ہوں، روئے زمین کی کسی اور کتاب میں اس کی نظیر نہیں۔

تم ضرور مسجدِ حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے

بے شک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا، حق کے ساتھ: تم ضرور مسجدِ حرام میں داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا، امن کے ساتھ، اپنے سر منڈواتے ہوئے اور بال کتراتے ہوئے، بے خوف

سورہ فتح – آیت 27

اُس وقت اتری جب مسلمان بیت اللہ میں داخل ہونے سے روکے گئے



فتح مکہ – ہجرت کا آٹھواں سال

امن کے ساتھ داخلے کا وعدہ... روکے جانے کے سخت ترین لمحے میں

آسان لفظوں میں

مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا گیا، اور وہ راستے ہی سے ٹوٹے دلوں کے ساتھ لوٹ آئے۔ تب ایک آیت نازل ہوئی جو انہیں وعدہ دیتی تھی کہ وہ بیت اللہ میں امن کے ساتھ داخل ہوں گے۔ دو برس بعد وہ بغیر لڑائی اور بغیر خوف کے مکہ میں فاتح بن کر داخل ہوئے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

6 ہجری میں، حدیبیہ کے مقام پر، مسلمانوں کو بیت اللہ سے لوٹا دیا گیا اور انہوں نے قریش سے ایسی شرطوں پر صلح کی جنہیں ان میں سے بہتوں نے زیادتی سمجھا، یہاں تک کہ عمر نے کہا: «ہم اپنے دین میں یہ ذلت کیوں قبول کریں؟»۔ اور مکہ اپنی قوت کے عروج پر تھا، اور مسلمان تعداد اور سامان دونوں میں کم۔ اور افق پر ایسی کوئی چیز نہ تھی جو کسی قریبی فتح کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

8 ہجری (630ء) میں نبی ﷺ دس ہزار کے سر پر مکہ میں داخل ہوئے، بغیر کسی قابل ذکر معرکے کے، اور عام معافی کا اعلان کیا: «جاؤ، تم سب آزاد ہو»۔ اور مسلمانوں نے امن کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا، اور سر منڈوائے اور بال کترائے۔ اور یہ اسلامی تاریخ کے سب سے زیادہ مستند واقعات میں سے ہے، اور تمام مآخذ اس پر متفق ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

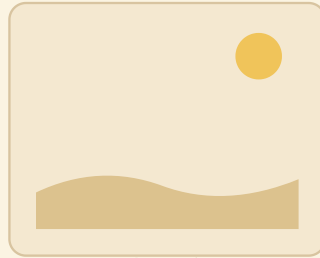
آیت کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی اسے امید سے اٹھا کر پیش گوئی بناتی ہیں۔ اس نے صرف اتنا نہیں کہا کہ «تم مکہ فتح کر لو گے»، بلکہ داخلے کی کیفیت بھی متعین کی: «امن کے ساتھ» – نہ کہ کسی خونریز جنگ کے بعد فاتح بن کر؛ اور «بے خوف» – مکمل امن کی تاکید؛ اور «اپنے سر منڈواتے ہوئے اور بال کتراتے ہوئے» – یعنی وہ اطمینان کے ساتھ پورا نسک ادا کریں گے، اور یہ شہر پر مکمل قابو کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ہی جملے میں چار تفصیلات، اور چاروں پوری ہوئیں۔

ایک وادی جس میں کھیتی نہ تھی... آج زمین کا سب سے پُرہجوم مقام

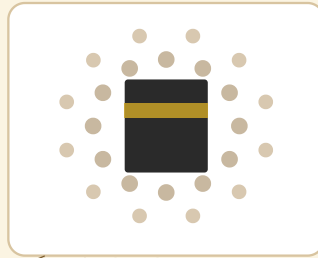
اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے کھیتی وادی میں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا... سو لوگوں میں سے کچھ دلوں کو ایسا کر دے کہ اُن کی طرف جھک پڑیں، اور اُنہیں پھلوں سے روزی دے

سورہ ابراہیم – آیت 37

ایک دعا جو ابراہیم علیہ السلام نے ہزاروں سال پہلے مانگی



بے کھیتی وادی



زمین پر سب سے زیادہ زیارت کی جگہ

ایسی زمین جو کچھ نہیں اُگاتی... اور اُس میں ساری دنیا کے پھل ملتے ہیں

آسان لفظوں میں

ابراہیم علیہ السلام نے، جب وہ اپنی بیوی اور بچے کو ایک ایسی وادی میں چھوڑ رہے تھے جہاں نہ پانی تھا نہ کھیتی، یہ دعا کی کہ اللہ لوگوں کے دل اُن کی طرف مشتاق کر دے اور اُنہیں پھلوں کی روزی دے۔ اور یہی وادی آج روئے زمین پر سب سے زیادہ لوگوں کی منزل ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

وہ وادی بنجر پہاڑوں کے بیچ ایک ننگا صحرا تھی؛ نہ دریا، نہ چشمہ، اور اُس زمانے میں نہ کوئی تجارتی راستہ۔ اُس میں کچھ نہ تھا جو کسی کو اپنی طرف بلائے۔ اور خود یہ دعا اپنے اندازِ بیان میں عجیب ہے: نہ کھیتی مانگی نہ زمین کے لیے پانی، بلکہ دو الگ چیزیں مانگیں: دل جو جھک پڑیں، اور پھل جو روزی بنیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

آج مکہ: صرف حج کے موسم میں بیس لاکھ سے زیادہ لوگ چند دنوں میں وہاں پہنچتے ہیں، اور لاکھوں سال بھر عمرہ کرتے ہیں۔ اور ایک ارب اسی کروڑ سے زیادہ انسانوں کے چہرے دن میں پانچ بار اُسی کی طرف اُٹھتے ہیں۔ اور اُس کی زمین نہیں بدلی: وہ آج بھی بے کھیتی وادی ہے۔ اِس کے باوجود اُس کے بازاروں میں آپ کو ساری زمین کے پھل ملتے ہیں، جو سال بھر ہر براعظم سے آتے ہیں۔ اور زمزم کا کنواں چار ہزار سال سے صحرا کے دل میں بہہ رہا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز خود اِس دعا کی ساخت میں ہے۔ فطری بات یہ تھی کہ جو شخص اپنے گھر والوں کو صحرا میں چھوڑ رہا ہو، وہ زمین کے سرسبز ہونے یا بارش برسنے کی دعا کرتا۔ مگر اُنہوں نے یہ دعا کی کہ لوگوں کے دل اُن کی طرف جھک پڑیں – یعنی روزی زمین سے نہیں، لوگوں کے ہاتھوں آئے۔ اور باریکی یہ کہ کہا «لوگوں میں سے کچھ دل»، نہ «سب لوگ» – کہ اگر سب مانگ لیتے تو وہ جگہ اُنہیں سما نہ سکتی۔ پھر کہا «جھک پڑیں»، نہ «اُٹیں» – اور جھک پڑنا شوق اور کشش سے گرنا ہے، مجبور ہو کر آنا نہیں۔ اور یہ ٹھیک اُس آدمی کے حال کا بیان ہے جو کعبہ کو پہلی بار دیکھتا ہے۔ اتنی باریکی سے کہی گئی ایک دعا، پھر چار ہزار سال تک حرف بہ حرف پوری ہوتی رہی۔

کسری کے دو کنگن سراقہ کے ہاتھوں میں

آپ نے سراقہ بن مالک سے فرمایا: تمہارا کیا حال ہو گا جب تم کسری کے دو کنگن پہنو گے؟

اسے بیہقی، ابن عبدالبر اور دوسروں نے روایت کیا



ایک آدمی جو سو اونٹوں کے لالچ میں آپ کو قتل کرنے نکلا... اسے کسری کے خزانوں کا وعدہ ملا

آسان لفظوں میں

سراقہ ہجرت کے دن انعام کے لالچ میں نبی ﷺ کا پیچھا کرنے نکلے۔ تو نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: **تمہارا کیا حال ہو گا جب تم فارس کے بادشاہ کے دو کنگن پہنو گے؟** اور برسوں بعد انہوں نے واقعی عمر بن خطاب کی خلافت میں وہ پہنے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جس لمحے یہ بات کہی گئی، وہ پوری سیرت کا سب سے نازک لمحہ ہے: نبی ﷺ اپنے شہر سے نکلے ہوئے، پیچھا کیے جاتے ہوئے، اپنی سواری اور اپنے ساتھی کے سوا کچھ نہ رکھتے ہوئے، اور آپ کے سر پر سو اونٹ مقرر تھے اس کے لیے جو آپ کو پکڑ لائے۔ اور فارس اس دن روئے زمین کی دو سب سے بڑی سلطنتوں میں سے ایک تھا، اور کسری نبی ﷺ کا خط مذاق اڑاتے ہوئے پھاڑ رہا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عمر بن خطاب کی خلافت میں ساسانی سلطنت گر گئی اور مدائن فتح ہوا، اور کسری کے خزانے مدینہ لائے گئے۔ تو عمر نے سراقہ بن مالک کو بلایا اور انہیں **کسری کے دو کنگن، اس کا تاج اور اس کی پیٹی** پہنائی، اور ان سے کہا: «کہیے: تمام تعریف اس اللہ کے لیے جس نے یہ کسری بن ہرمز سے چھین کر بنو مدلج کے ایک بدوی سراقہ بن مالک کو پہنا دیے»۔ اور یہ خبر حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں متعدد سندوں سے مروی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ پیش گوئی تین ایسی چیزیں جمع کرتی ہے جن کا اندازے سے جمع ہونا ناممکن ہے: **ایک متعین شخص نام کے ساتھ (سراقہ)، اور ایک متعین چیز بعینہ (کسری کے دو کنگن، نہ کہ کوئی بھی مالِ غنیمت)، اور ایک زبردست سیاسی واقعہ (فارس کا گرنا اور اس کے خزانوں کا عربوں تک پہنچنا)۔** اور یہ ایسے آدمی سے کہی گئی جو اس لمحے **پیچھا کرنے والا دشمن** تھا، نہ کہ خوشخبری پانے والا کوئی ساتھی۔ اور اگر مقصود دل جیتنا ہوتا تو چھوٹے سے چھوٹا وعدہ زیادہ کارآمد ہوتا۔ رہا یہ کہ ایک پیچھا کیا جانے والا آدمی، جو اس دن اپنی جان کے سوا کچھ نہ رکھتا تھا، اپنے تعاقب کرنے والے سے سب سے بڑی سلطنت کے خزانوں کا وعدہ کرے — تو یہ اس کی بات ہے جسے اپنے ماخذ پر پورا یقین ہے، اور وہ ماخذ انسانی نہیں۔

ماخذ الطبری — «تاریخ الرسل والملوک»

وہ رات کو دن پر لیٹتا ہے

اُس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر لیٹتا ہے اور دن کو رات

پر لیٹتا ہے۔

سورہ زمر - آیت 5



رات اور دن زمین کے گزرنے کے گرد لیٹتے ہیں، ایسی گردش میں جو کبھی نہیں رکتی

آسان لفظوں میں

لفظ «یُکْوَر» «گُره» سے نکلا ہے اور «عمامہ لیٹنے» سے — یعنی **کسی گول چیز پر کسی چیز کا لیٹنا جانا**۔ سو رات زمین کو یوں لیپٹتی ہے جیسے عمامہ سر کو لیپٹتا ہے۔ اور لیپٹ گول جسم ہی پر ہوتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ہر جگہ عام لوگوں میں یہی مشہور تھا کہ زمین ایک پھیلی ہوئی سطح ہے، اور رات دن کی جگہ لے لیتی ہے اور اُسے مٹا دیتی ہے۔ یونانی فلسفیوں میں سے جنہوں نے زمین کو گول کہا، انہوں نے بھی اسے رات اور دن کی حد کی مسلسل لیپٹتی حرکت سے نہ جوڑا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زمین ایک کڑہ ہے (دونوں قطبوں پر ذرا چپٹا)، اور سورج ہمیشہ اُس کے آدھے حصے کو روشن رکھتا ہے۔ زمین کا اپنے گرد گھومنا **رات اور دن کے درمیان کی حد** کو اُس کی سطح پر بغیر رُکے سرکاتا رہتا ہے — یعنی رات لفظاً کڑے کے گرد لیپٹتی ہے، مٹی نہیں بلکہ آگے بڑھتی ہے۔ اور یہ آپ اپنی آنکھ سے زمین کی کسی بھی زندہ سیارہ تصویر میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

رات اور دن کے پے در پے آنے کو بیان کرنے کے لیے «گُره» کے مادے سے فعل چُننا کسی ہموار سطح پر معنی نہیں رکھتا۔ اور اس سے بھی باریک بات یہ ہے: آیت اس لیپٹ کو **دونوں طرف سے باہم** بناتی ہے — «وہ رات کو دن پر لیپٹتا ہے اور دن کو رات پر لیپٹتا ہے» — اور ایسا وہی بیان کر سکتا ہے جو کسی گول جسم پر مسلسل گردش دیکھ رہا ہو۔ اور ایک دوسری جگہ: «اور اُس کے بعد زمین کو دُحا کیا» — اور عربی میں دُحو کا معنی پھیلانا، بچھانا اور ہموار کرنا ہے، یعنی سطح کو بسنے کے قابل بنانے کا بیان۔ گولائی پر دلالت کا اصل سہارا «یُکْوَر» ہی ہے، «دُحا» نہیں؛ کیونکہ مادہ گُره سے صرف وہی نکلا ہے۔

لوٹانے والا آسمان

قسم ہے آسمان کی جو لوٹاتا ہے

سورہ الطارق – آیت 11



پانی بھاپ بن کر چڑھتا ہے اور بارش بن کر لوٹتا ہے – ایک بند چکر جس سے کچھ ضائع نہیں ہوتا

آسان لفظوں میں

آسمان سمندر سے پانی بھاپ بنا کر لیتا ہے، پھر اُسے بارش بنا کر ہماری طرف **لوٹاتا** ہے۔ آج آپ جو قطرہ پیتے ہیں وہ آپ سے پہلے کسی نے پیا تھا، اور آپ کے بعد کوئی پیے گا۔ پانی ختم نہیں ہوتا، لوٹتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بارش کو **نیا** پانی سمجھا جاتا تھا جو اللہ آسمان کے خزانوں سے اُتارتا ہے، نہ کہ خود زمین سے لوٹنے والا پانی۔ ارسطو نے بھاپ کے چڑھنے اور بارش بن کر لوٹنے کا ذکر کیا، مگر وہ بے پیمائش نظری بات رہی؛ اور پانی کا چکر ایک ایسے بند نظام کے طور پر جس میں بارش دریاؤں کا بہاؤ پورا کرتی ہے، سترہویں صدی سے پہلے ثابت نہ ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پانی کا چکر: آبی سطحوں سے بخارات ← بادل میں تکثیف ← بارش ← بہاؤ ← پھر بخارات۔ زمین پر پانی کی مقدار **اربوں برس سے ثابت ہے**، گھومتی رہتی ہے، نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی۔ اور فضا صرف پانی ہی نہیں لوٹاتی، بلکہ حرارت اور ریڈیو لہریں بھی لوٹاتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

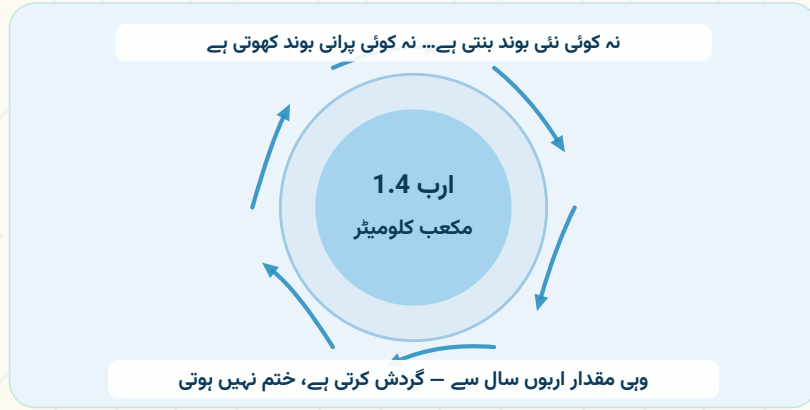
ایک ہی لفظ «الرَّجْع» پورا مفہوم اُٹھائے ہوئے ہے۔ رجع کے معنی ہیں **کسی چیز کا اپنی جگہ لوٹ آنا**، محض اُترنا نہیں۔ تو آسمان کو یہ صفت دینا اس کا اعلان ہے کہ جو اُس سے اُترتا ہے وہ پہلے اُسی کی طرف چڑھا تھا۔ یہ دو لفظوں میں پانی کے پورے چکر کا خلاصہ ہے۔ اور دوسری جگہ اس کی تائید ہے: «اور ہم نے آسمان سے **ایک اندازے کے ساتھ** پانی اُتارا» – یعنی ایک مقرر اور ثابت مقدار جو بدلتی نہیں۔

ایک اندازے سے پانی... نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے

اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے سے پانی اتارا، پھر اسے زمین میں ٹھہرا دیا۔ اور یہ شک ہم اسے

لے جانے پر بھی قادر ہیں

سورہ المؤمنون – آیت 18



پورے سیارے کی سطح پر ایک ثابت آبی میزان

آسان لفظوں میں

زمین پر پانی کی مقدار **ثابت ہے**: نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔ جو پانی ڈائنوسار نے پیا تھا وہی پانی آج آپ پیتے ہیں۔ اور آیت میں «بَقْدَر» کا مطلب ہے: ایک شمار کی ہوئی، ٹھیک ٹھیک مقدار میں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بارش کو یوں سمجھا جاتا تھا کہ یہ نیا پانی ہے جو آسمان کے خزانوں سے اُس وقت اتارا جاتا ہے جب لوگوں کو ضرورت ہو۔ اور **ایک بند، ثابت مقدار کے گردش کرنے** کا تصور کسی ثقافت میں موجود نہ تھا۔ ظاہری بات تو یہی ہے کہ سمندر کا پانی بھاپ بن کر کم ہوتا ہے اور بارش ایک نیا اضافہ ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زمین پر پانی کا حجم تقریباً **1.4 ارب مکعب کلومیٹر** بتایا جاتا ہے، اور یہ اربوں برس سے تقریباً ثابت ہے۔ وہ بھاپ بنتا ہے، جمتا ہے، برستا ہے، بہتا ہے اور لوٹ آتا ہے – ایک ایسے بند چکر میں جو نہ کچھ بڑھاتا ہے نہ کچھ گھٹاتا ہے۔ اور فضا اور مقناطیسی میدان مل کر آبی بخارات کو خلا میں نکل جانے سے روکتے ہیں – اور مریخ پر یہی نہ ہو سکا، سو اس کا بیشتر پانی بھاپ بن کر خلا میں ضائع ہو گیا اور وہ ایک مردہ صحرا بن کر رہ گیا۔

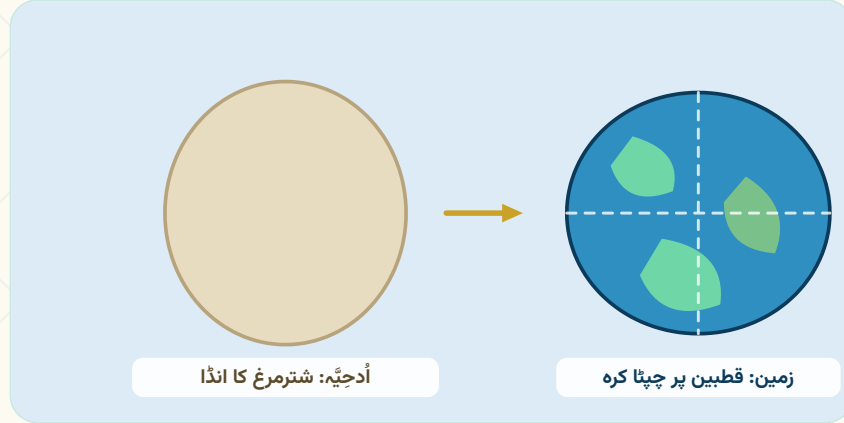
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قید «بَقْدَر» ہی اعجاز کا مقام ہے، اور مقدار کے ثابت ہونے بغیر اس کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا۔ اگر پانی ہر بار برستے وقت نیا پیدا ہوتا تو اس کے اندازے کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ اور اس سے زیادہ باریک وہ ہے جو آگے آیا: «**پھر اسے زمین میں ٹھہرا دیا**» – اور ٹھہرانا قیام اور باقی رہنے کا فائدہ دیتا ہے، خرچ ہو جانے کا نہیں؛ سو پانی زمین میں ذخیرہ ہے، اس میں خرچ نہیں ہو جاتا۔ پھر آخری تنبیہ: «**اور بے شک ہم اسے لے جانے پر بھی قادر ہیں**» – یعنی یہ میزان ایک نعمت ہے جو اٹھائی بھی جا سکتی ہے۔ اور آج اہل علم اسے مریخ میں ایک قائم حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں، جس نے اپنا اسی فیصد سے زیادہ پانی کھو دیا، اور اس کے صرف دونوں قطبوں کی برف اور سطح کے نیچے کا پانی باقی رہا۔

اور زمین کو اُس کے بعد اُس نے بچھا دیا

اور زمین کو اُس کے بعد اُس نے بچھا دیا۔ اُس سے اُس کا پانی اور اُس کا چارہ نکالا

سورہ النازعات – آیتیں 30-31



زمین کامل کرہ نہیں، بلکہ قطبین پر چپٹی اور خط استوا پر ابھری ہوئی ہے

آسان لفظوں میں

عربی میں لفظ «دَحَا» کے معنی ہیں: **بچھانا، وسیع کرنا اور ہموار کرنا**۔ اِسی سے «اُدجّیہ» ہے – شترمرغ کے انڈے رکھنے کی جگہ، جسے یہ نام اِس لیے ملا کہ وہ اُسے اپنے پاؤں سے دھو یعنی بچھاتی ہے۔ تو زمین بچھائی گئی ہے تاکہ آپ اُس پر چلیں اور اُس میں بسیں – رہی اُس کی گولائی، تو اُس کا محل «یُکُوْر» ہے، «دَحَا» نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عام لوگوں کے تصور میں زمین ایک ہموار سطح کے سوا کچھ نہ تھی۔ اور فلسفیوں میں سے جنہوں نے اُسے گول کہا، اُنہوں نے **کامل گول کرہ** کہا۔ رہی قطبین پر چپٹائی، تو اُس کا قائل کوئی بھی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زمین **چپٹا کرہ** (Oblate Spheroid) ہے: خط استوا پر اُس کا قطر قطبین کے درمیان قطر سے تقریباً 43 کلومیٹر زیادہ ہے، اپنے محور پر گھومنے کے سبب۔ نیوٹن نے یہ 1687 میں نظری طور پر ثابت کیا، پھر فرانسیسی مہمات نے 1736 میں میدان میں ناپا۔ اور «جیونڈ» کہلانے والی دقیق شکل اِس چپٹے کرے سے دو سو میٹر سے بھی کم ہٹتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں زبان فیصلہ کر دیتی ہے۔ عربی لغات میں «دَحَا يَدْحُو دَحَوًّا»: بچھایا اور وسیع کیا، اور «اُدجّی» و «اُدجّیہ»: شترمرغ کے انڈے رکھنے کی جگہ اور اُس کا انڈا۔ اور اِس لغوی مادے میں گولائی سرے سے نہیں: «اُدجّی» کا نام **بچھانے سے ہے، انڈے کی شکل سے نہیں** – شترمرغ اپنی جگہ کو پاؤں سے دھو کرتی یعنی بچھاتی ہے۔ اور گولائی کا محل ایک دوسرا فعل ہے، خود کرے ہی کے مادے سے: «وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے»۔ اور یہاں «بَسَطَ» اور «مَدَّ» کے بجائے «دَحَا» کا انتخاب ہمواری اور تیاری کے لیے ہے، شکل کے لیے نہیں۔ اور کنجی یہ ہے کہ اگلی آیت نے خود بچھانے کا مقصد بیان کر دیا: «اُس سے اُس کا پانی اور اُس کا چارہ نکالا» – یعنی بسنے کے لیے تیاری، نہ کہ چپٹا کر دینا۔

شہد میں لوگوں کے لیے شفا ہے

اُن کے پیٹوں سے ایک مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، اُس میں لوگوں کے لیے شفا ہے

سورہ نحل – آیت 69



خام شہد

شہد کی طبی پٹی یورپ اور امریکہ میں سرکاری طور پر منظور

طب نے جو ثابت کیا

- بیکٹیریا کو مارتا ہے
- زخموں اور جلنے کا علاج
- بچوں کی کھانسی کو تسکین دے
- اینٹی آکسیڈنٹ اور سوزش کش
- آج ہسپتالوں میں مستعمل

شہد کی طبی پٹیاں آج سرکاری اجازت کے ساتھ دواخانوں میں بکتی ہیں

آسان لفظوں میں

قرآن نے 1400 سال پہلے کہا کہ شہد میں **شفا** ہے۔ اور آج شہد ہسپتالوں میں اُن زخموں اور جلنے کے گھاؤ کے علاج میں استعمال ہوتا ہے جن کے سامنے اینٹی بائیوٹکس بے بس رہی ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

شہد ایک میٹھی غذا اور قیمتی خوراک تھا، اور عوامی تجربے کی بنیاد پر اُس کی طرف کچھ فائدے منسوب کیے جاتے تھے۔ مگر الہی خبر کے طور پر یہ فیصلہ کر دینا کہ اُس میں **شفا** ہے، ایک بالکل اور بات ہے – خاص طور پر جب وہ ایک حشرے کے پیٹ سے نکلتا ہے، جس سے عقلاً فائدے کی توقع بعید تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شہد تین طریقوں سے قدرتی اینٹی بائیوٹک ہے: اس کی شکر کی کثافت جراثیم سے پانی کھینچ کر اُنہیں مار دیتی ہے؛ اس کی تیزابیت اُن کی نشوونما روکتی ہے؛ اور اس میں موجود گلوکوز آکسیڈیز نامی خامرہ آہستہ آہستہ اور مسلسل **ہائیڈروجن پراکسائیڈ** بناتا رہتا ہے۔ سرکاری دوا ساز اداروں نے نہ بھرنے والے پرانے زخموں کے لیے مانوکا شہد کی پٹیاں منظور کی ہیں، اور عالمی ادارہ صحت نے بچوں کی کھانسی کے لیے شہد کی سفارش کی ہے۔ اور فرعونی مقبروں میں ملنے والا شہد تین ہزار سال بعد کھانے کے قابل نکلا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دو مقام ایسی باریکی کے ہیں جن کی توجیہ عوامی تجربے سے نہیں ہو سکتی۔ پہلا: «جس کے **رنگ** مختلف ہیں» – اور آج یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ شہد کا رنگ اور اُس کی طبی خصوصیات نباتی ماخذ کے فرق سے بدلتی ہیں، اسی لیے اُس کا علاجی اثر بھی مختلف ہوتا ہے۔ دوسرا: «اُن کے **پیٹوں** سے نکلتا ہے» – اور شہد واقعی **شہد کے معدے** میں بنتا ہے، جو ہضم کے معدے سے الگ ایک اندرونی تھیلی ہے، وہیں اُس میں خامرے شامل کیے جاتے ہیں، پھر وہیں سے اگل دیا جاتا ہے۔ یوں متن نے صحیح تشریحی ماخذ کو باریکی سے متعین کر دیا۔

سورج چلتا ہے... ٹھہرا ہوا نہیں

اور سورج اپنے ٹھہرنے کی جگہ کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اُس زبردست، سب کچھ جاننے والے کا مقرر کیا ہوا ہے

سورہ یسین - آیت 38



سورج کہکشاں کے مرکز کے گرد تیرتا ہے اور اپنے سارے سیارے ساتھ گھسیٹتا جاتا ہے

آسان لفظوں میں

سورج اپنی جگہ کھڑا نہیں ہے۔ وہ زبردست رفتار سے **چل رہا ہے**، اور زمین اور تمام سیاروں کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا ہماری کہکشاں کے مرکز کے گرد ایک سفر پر ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگ سورج کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھتے تھے، تو سمجھتے تھے کہ اُس کی حرکت بس زمین کے گرد ایک چکر ہے۔ پھر جدید دور آیا اور اُس نے کہا: نہیں، گھومنے والی تو زمین ہے، اور **سورج نظام کے مرکز میں ساکن ہے**۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی بھر یہی «مستحکم سائنس» رہی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سورج واقعی تین ثابت شدہ حرکتیں کرتا ہے: وہ تقریباً ہر 25 دن میں اپنے محور پر گھومتا ہے؛ وہ ملکی وے کہکشاں کے مرکز کے گرد تقریباً **220 کلومیٹر فی سیکنڈ** کی رفتار سے چلتا ہے اور ہر 225 ملین سال میں ایک چکر پورا کرتا ہے؛ اور وہ آسمان میں ایک نقطے کی طرف بھی بڑھ رہا ہے جسے «شمسی اپیکس» کہتے ہیں۔

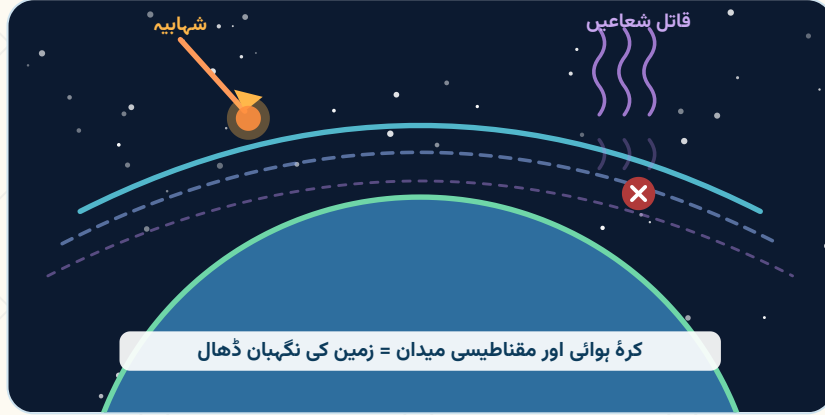
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے: آیت اُس وقت اُتری جب لوگ سمجھتے تھے کہ سورج اُن کے گرد گھومتا ہے، تو اُس نے سورج کے لیے «چلنا» ثابت کیا۔ پھر ایک دور آیا جس نے اُس سے ہر حرکت کی نفی کر دی اور کہا «وہ ساکن ہے»، تو آیت ایسی لگنے لگی جیسے سائنس کے خلاف ہو۔ پھر نئی سائنس آئی اور اُس نے سورج کے لیے ایک حقیقی چال ثابت کی جو **کسی کے تصور سے کہیں بڑی تھی**۔ ایک ہی عبارت جو سائنس کے دو مکمل انقلابوں کے سامنے ڈٹی رہی — اور یہی اکیلی بات ایک دلیل ہے۔

ایک چھت جو آپ کو بچاتی ہے اور آپ اُسے دیکھتے نہیں

❖ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا، اور وہ اُس کی نشانیوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں ❖

سورہ انبیا - آیت 32



ہزاروں شہابیہ ہر روز آپ تک پہنچنے سے پہلے جل جاتے ہیں، اور آپ اپنے گھر میں سو رہے ہوتے ہیں

آسان لفظوں میں

آپ کے سر پر ایک چھت ہے جو دکھائی نہیں دیتی، مگر وہ آپ کی حفاظت کرتی ہے۔ جو شہابیہ ہماری طرف بڑھتے ہیں وہ پہنچنے سے پہلے اُسی میں جل جاتے ہیں، اور قاتل شعاعیں وہ روک لیتی ہے۔ **اگر وہ نہ ہوتی تو زمین پر ہر جاندار مر جاتا۔**

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک «آسمان» یا تو خالی خلا تھا، یا ایک ٹھوس گنبد جس میں ستارے جڑے ہوئے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمارے اوپر ایک ایسی تہ ہے جو **نظر نہیں آتی اور حفاظت کا کام کرتی ہے**۔ جلتا ہوا شہاب اُن کی نظر میں ایک گرتا ہوا تارا تھا، نہ کہ کوئی شہابیہ جو ایک ڈھال میں جل رہا ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

کرہ ہوائی روزانہ اندازاً سو ٹن خلائی مادہ ہم تک پہنچنے سے پہلے جلا دیتا ہے۔ اور اوزون کی تہ قاتل بالائے بنفشی شعاعوں کا تقریباً 99% جذب کر لیتی ہے۔ اور زمین کا مقناطیسی میدان **شمسی ہواؤں** کو روکتا ہے، جو ورنہ زمین کو اُس کی ہوا اور پانی سے محروم کر چکی ہوتیں، بالکل جیسا مریخ کے ساتھ ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز «سَقْف» اور «مَحْفُوظ» دو لفظوں کے جوڑ میں ہے۔ «سَقْف» پورے ڈھانپنے پر دلالت کرتا ہے، اور «مَحْفُوظ» اسم مفعول کا صیغہ ہے جو بتاتا ہے کہ وہ **خود بھی محفوظ ہے اور اپنے نیچے والوں کی حفاظت بھی کرتا ہے**۔ پھر اگلا جملہ آیا: «اور وہ اُس کی نشانیوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں» - یعنی اِس چھت میں ایسی **نشانیوں** ہیں جن سے لوگ غافل رہیں گے۔ یہ صاف اشارہ ہے کہ اِس میں ایسے عجائب ہیں جو ابھی دریافت نہیں ہوئے۔ اور ایسا ہی ہوا: اوزون کی تہ 1913 سے پہلے دریافت نہ ہوئی، اور شمسی ہوا کو روکنے میں مقناطیسی میدان کا کردار «وان ایلن» پٹیوں کی 1958 میں دریافت سے پہلے معلوم نہ تھا۔

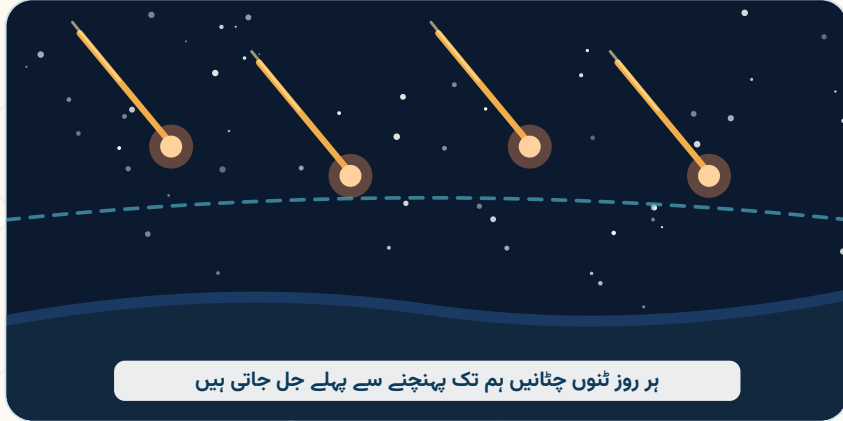
ماخذ Fabry & Buisson (1913) – the ozone layer · Van Allen (1958) – the radiation belts

وہ شہاب جو آسمان کی نگہبانی کرتے ہیں

اور بے شک ہم نے دنیا کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا، اور اُنہیں شیطانوں کے لیے رُجوم

بنایا۔

سورہ مُلک - آیت 5



شہاب اُس وقت بھڑکتا ہے جب گولی سے تیز رفتار سے فضا میں داخل ہوتا ہے

آسان لفظوں میں

آیت ستاروں اور روشن اجرام کو ایک ساتھ دو کام دیتی ہے: **آسمان کی زینت**، اور **وہ گولے جو اوپر چوری چہپے چڑھنے والے کو بھگاتے ہیں**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

شہاب عربوں کی نظر میں «گرتے ہوئے تارے» تھے، اور دوسری تہذیبوں میں کسی بادشاہ کی موت یا کسی بڑے واقعے کی نشانی۔ رہا یہ کہ وہ **ٹھوس اجسام ہیں جو رگڑ سے جل اٹھتے ہیں** - یہ معلوم نہ تھا۔ بلکہ سرکاری علم انیسویں صدی تک اس کا انکار کرتا رہا کہ آسمان سے پتھر گر سکتے ہیں، اور فرانسیسی اکادمی نے یہ کہنے والوں کا مذاق اڑایا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شہاب سنگ پتھریلے اور دھاتی اجسام ہیں جو دسیوں کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے فضائی غلاف میں داخل ہوتے ہیں، اور اُن میں سے اکثر ہوا کے دباؤ اور حرارت سے پوری طرح جل جاتے ہیں۔ روزانہ داخل ہونے والی مقدار کا اندازہ تقریباً **سو ٹن** ہے۔ اور فرانس میں 1803 میں «لیگل» کے واقعے کے بعد شہاب سنگوں کا گرنا علمی طور پر ثابت ہو گیا۔

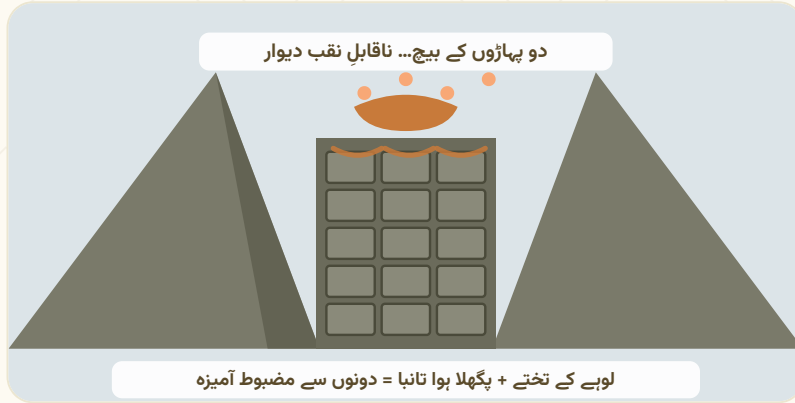
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے آسمانی اجرام کے دو الگ کام کیے: **ٹھہری ہوئی زینت**، اور **چلتا ہوا رجم**۔ اور عربی میں رجم کا معنی خاص طور پر پتھر مارنا ہے - نہ روشنی سے مارنا، نہ آگ سے۔ سو آسمان سے جلتے ہوئے اترنے والی چیز کو «رجم» یعنی پھینکا ہوا پتھر کہنا، اُس زمانے میں جب سرکاری علم - اس کے صدیوں بعد تک - آسمان میں پتھروں کے وجود ہی کا انکار کرتا تھا، ایسا بیان ہے جس کا اتفاق ہونا محال ہے۔

ذوالقرنین کی دیوار... لوہا اور پگھلا ہوا تانبا

میرے پاس لوہے کے تختے لاؤ — یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان برابر کر دیا تو کہا: پھونکو۔
یہاں تک کہ جب اس نے اسے آگ بنا دیا تو کہا: میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ کہ میں اس پر انڈیل دوں

سورہ کہف — آیت 96



لوہے پر پگھلا تانبا انڈیلنا خلا بھر دیتا ہے اور زنگ سے بچاتا ہے

آسان لفظوں میں

ذوالقرنین نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک دیوار بنائی: **لوہے کے ٹکڑے** جما دیے، پھر آگ بھڑکائی یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گئے، پھر ان پر **پگھلا ہوا تانبا** انڈیل دیا۔ اور بالکل یہی وہ طریقہ ہے جس سے انتہائی سخت اور زنگ نہ لگنے والا کھوٹ بنایا جاتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دھاتوں کا علم سادہ تھا: لوہا جو گرم گرم کوٹا جائے، اور تانبا جو سانچوں میں ڈھالا جائے۔ اور **دو دھاتوں کو ایک ہی ڈھانچے میں جوڑ دینے** کا خیال کسی تعمیری تکنیک کے طور پر معلوم نہ تھا، اور نہ یہ کہ ایک کو دوسرے پر گرم حالت میں انڈیلا ہی کیوں جائے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

گرم لوہے پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلنے سے **تانبا کی لحیم کاری** (Brazing) جیسی چیز بنتی ہے: مائع تانبا خاصیتِ شعریت سے ٹکڑوں کے خلا میں سرایت کر جاتا ہے، انہیں مضبوطی سے باندھ دیتا ہے اور ہوا کو باہر نکال دیتا ہے۔ نتیجہ ایک ٹھوس جڑا ہوا تودہ ہے جس میں کوئی خلا نہیں۔ نیز تانبے کا غلاف **لوہے کو ہوا اور نمی سے الگ کر دیتا ہے اور یوں زنگ سے بچاتا ہے** — اور یہی آج کی دھاتی ملمع کاری کا اصول ہے۔

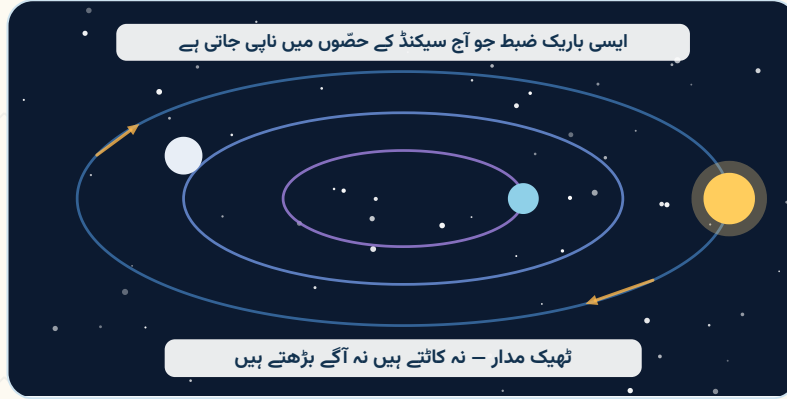
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قدموں کی ترتیب ہی موضعِ اعجاز ہے، اور یہ ایسی ہندسی ترتیب ہے جس کے سوا کوئی اور درست ہو ہی نہیں سکتی: (1) **لوہے کے تختے** — اور «زبرہ» بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں، سو بوجھ اٹھانے والا ڈھانچہ لوہا ہے۔ (2) **پھونکنا** — یعنی حرارت بڑھانے کے لیے ہوا پہنچانا، اور یہی کام ڈھلائی خانوں میں دھونکنی کرتی ہے۔ (3) **یہاں تک کہ جب اس نے اسے آگ بنا دیا** — یعنی لوہا اس سرخی کے درجے تک پہنچ گیا جس پر وہ جڑنا قبول کرتا ہے۔ (4) **پھر پگھلا ہوا تانبا انڈیلنا** اس پر۔ اگر تانبا ٹھنڈے لوہے پر انڈیلا جاتا تو جڑتا ہی نہیں۔ سو متن انڈیلنے سے پہلے حرارت کی شرط بیان کرتا ہے — اور یہی پورے عمل کی جان ہے۔

سورج چاند کو جا نہیں پکرتا... اور نہ ٹکراؤ

نہ سورج کے لیے یہ روا ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن سے آگے بڑھنے والی ہے۔ اور سب ایک ایک مدار میں تیر رہے ہیں

سورہ یسین – آیت 40



ہر جرم اپنی راہ پر ہے: نہ اس سے باہر، نہ کسی دوسرے تک

آسان لفظوں میں

آسمانی اجرام زبردست رفتاروں سے چل رہے ہیں، پھر بھی ان میں سے کوئی دوسرے سے نہیں ٹکراتا، اور نہ رات دن سے آگے بڑھتی ہے نہ اس سے پیچھے رہتی ہے۔ ایک ایسا نظام جو پلک جھپکنے بھر کو بھی نہیں بگڑتا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس وقت نہ اجرام کی رفتاروں کا علم تھا، نہ ان کے مداروں کا، نہ ان کی حرکت کے قوانین کا۔ اور گرہن کی تعبیر غضب یا کسی آنے والی آفت سے کی جاتی تھی، اس سے نہیں کہ یہ ایسے مقررہ اوقات ہیں جو صدیوں پہلے شمار کیے جا سکتے ہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اجرام کے مدار ایسی باریکی سے بندھے ہیں کہ ماہرینِ فلکیات دنگ رہ جاتے ہیں۔ زمین سورج کے گرد اپنا مدار 30 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے طے کرتی ہے، چاند اس کے گرد گھومتا ہے، اور کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اور نظام کی درستی اس حد کو پہنچی ہے کہ **اس صدی کے گرہن سیکنڈ کی باریکی سے شمار کیے جاتے ہیں**، اور آنے والے ایک ہزار برس کے گرہن چند دسیوں منٹ کے فرق تک – اور اس فرق کا سبب زمین کی گردش کی رفتار کا بدلنا ہے، مداروں کی کوئی خرابی نہیں۔ اور اسی ضبط پر خلائی سفر کی ساری نقل و حرکت کھڑی ہے: ایک گاڑی آج چھوڑی جاتی ہے تاکہ سات برس بعد ایک پہلے سے شمار کیے ہوئے مقام پر کسی سیارے سے جا ملے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

»**روا ہے**« کی تعبیر ہی باریکی کا مقام ہے۔ یہ صرف واقع ہونے کی نفی نہیں کرتی، بلکہ **امکان** ہی کی نفی کرتی ہے – یعنی نظام خود اس کی اجازت نہیں دیتا، یہ نہیں کہ محض اتفاقاً ایسا نہیں ہوا۔ اور یہی **طبیعی قانون** کا عین مفہوم ہے۔ پھر تفصیل پر غور کیجیے: سورج کے چاند کو جا پکڑنے کی نفی کی – اور یہ دونوں دو مختلف مداروں میں ہیں؛ اور رات کے دن سے آگے بڑھنے کی نفی کی – اور یہ دونوں زمین کی گردش کے تابع ہیں۔ دو الگ اسباب والے مظاہر، ایک ہی قاعدے کے تحت جمع کر دیے گئے: **»اور سب ایک ایک مدار میں تیر رہے ہیں«** – یعنی دونوں صورتوں میں علت ایک ہی ہے: ہر جرم کا اپنے مدار کا پابند ہونا۔

ماخذ (Newton – Principia, 1687 (orbital mechanics)

آپ رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے ربطی نہ دیکھیں گے

جس نے سات آسمان تہ بہ تہ بنائے۔ آپ رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے ربطی نہ دیکھیں گے۔ پھر نگاہ

دوڑائیے — کیا آپ کو کوئی شگاف دکھائی دیتا ہے؟

سورہ الملک — آیت 3



کشش ثقل: ذرا بڑھ جاتی تو کائنات پچک جاتی



نویاتی قوت: ذرا کم ہوتی تو ایک عنصر بھی نہ بنتا



کائنات کی ابتدائی کثافت: تصوّر سے بڑھ کر ضبط



تاریک توانائی کا ثابت: طبیعیات کا باریک ترین عدد

«پھر نگاہ دوڑائیے، کیا کوئی شگاف ہے؟»

کائنات کے ثوابت ایسی حد پر بندھے ہیں جو ذرا سے انحراف کی بھی گنجائش نہیں رکھتی

آسان لفظوں میں

آیت آپ کو چیلنج کرتی ہے کہ کائنات میں نگاہ دوڑا کر اس میں **کوئی خرابی، کوئی شگاف یا کوئی کمی** تلاش کیجیے۔ پھر دہراتی ہے: دوبارہ دیکھیے۔ اور آج سائنس کہتی ہے کہ کائنات کے ثوابت ایسی باریکی سے بندھے ہیں جس پر عقل یقین ہی نہیں کر پاتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کائنات کو ایک عمومی، جمالیاتی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور «طبیعی ثوابت» کا تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا، اور نہ یہ خیال کہ کائنات ایسے اعداد پر قائم ہے کہ ان میں سے ایک بھی ذرا سا بدل جائے تو سب کچھ ڈھے جائے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جدید طبیعیات اسے «**باریک ضبط**» (Fine-Tuning) کہتی ہے۔ اگر کشش ثقل کی قوت ایک نہایت معمولی نسبت سے مختلف ہوتی تو ستارے کبھی نہ بنتے یا کائنات فوراً بھنچ کر رہ جاتی، اگر شدید نویاتی قوت ایک چھوٹی سی نسبت سے مختلف ہوتی تو نہ کاربن ہوتا نہ آکسیجن؛ اور تاریک توانائی کے ثابت کو **ساری طبیعیات کا سب سے باریک عدد** کہا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے ماہرین طبیعیات نے اس کا اعتراف کیا ہے — جیسے فریڈ ہوئل، جس نے کہا کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ ایسا لگتا ہے گویا «کسی برتر عقل نے طبیعیات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہو»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت میں بات محض ایک خبر نہیں، بلکہ **جانچنے اور بار بار جانچنے کی صریح دعوت** ہے: «پھر نگاہ دوڑائیے»، پھر «دو بار نگاہ دوڑائیے»۔ یعنی یہ اس پر داؤ لگاتی ہے کہ باریک بینی اسے **مضبوط ہی کرے گی، توڑے گی نہیں**۔ اور لفظاً یہی ہوا: مشاہدے کے آلات جتنے زیادہ باریک ہوتے گئے، ضبط اتنا ہی زیادہ کھل کر سامنے آتا گیا۔ اور لفظ «**فُطُور**» کے معنی ہیں شگاف اور دراڑیں، اور «**تَفَاوُت**» کے معنی ہیں بے ترتیبی اور بے تناسبی۔ سو آیت کائنات سے دو صفتیں نفی کرتی ہے: نسبتوں میں خرابی، اور عمارت میں دراڑ — اور بالکل یہی وہ چیز ہے جو ایک ماہر طبیعیات کسی کونیاتی نمونے کو جانچتے وقت تلاش کرتا ہے۔

ستاروں کے مقامات کی قسم... خود ستاروں کی نہیں

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی — اور بے شک یہ بڑی قسم ہے، اگر آپ

جانیں۔

سورہ واقعہ — آیات 75-76



ستارے کی روشنی برسوں سفر کرتی ہے، سو جو آپ دیکھتے ہیں وہ اُس کا پرانا مقام ہے، موجودہ جگہ نہیں

آسان لفظوں میں

جب آپ رات کو کسی ستارے کو دیکھتے ہیں تو آپ ستارے کو نہیں دیکھ رہے! آپ **وہ روشنی دیکھ رہے ہیں جو برسوں پہلے اُس سے نکلی تھی**، شاید ہزاروں برس پہلے۔ ہو سکتا ہے وہ ستارہ خود بجھ کر ختم ہو چکا ہو اور آپ اب بھی اُسے دیکھ رہے ہوں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ارسطو اور اُس کے پیروکاروں کے نزدیک روشنی بغیر کسی وقت کے، فوراً ظاہر ہو جاتی تھی؛ امپیڈوکلیس جیسے چند لوگوں کے سوا کسی نے اختلاف نہ کیا، وہ بھی بغیر دلیل کے۔ ستارہ وہی تھا جو آپ دیکھتے ہیں، اُسی جگہ جہاں دیکھتے ہیں، اور بات ختم۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

روشنی کی رفتار تقریباً 300 ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے — تیز ضرور، مگر **محدود**۔ سورج کے بعد ہمارا قریب ترین ستارہ 4.2 نوری سال دور ہے، اور جو کچھ ہم ننگی آنکھ سے دیکھتے ہیں اُس میں سے کچھ ہزاروں نوری سال دور ہے۔ سو آج رات آپ جو آسمان دیکھتے ہیں وہ **پرانی تصویروں کا البم** ہے، اُس کا ہر ستارہ کسی اور زمانے کا۔ اور واقعی ایسے ستارے دیکھے جا چکے ہیں جو صدیوں پہلے پھٹ چکے اور اُن کی روشنی اب تک ہم تک پہنچ رہی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

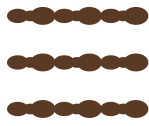
قسم خود ستاروں کی نہیں کھائی گئی، بلکہ **اُن کے مقامات** کی — اور یہ ایسی تخصیص ہے جس کا کوئی سبب نہیں، سوائے اُس کے کہ ستارے اور اُس کے مقام میں کوئی حقیقی فرق ہو۔ پھر اگلی آیت کھول کر کہتی ہے: «اور بے شک یہ بڑی قسم ہے، اگر آپ جانیں» — یعنی اِس قسم کی عظمت ایک ایسے علم پر موقوف ہے جو سننے والوں کے پاس نہ تھا۔ ایک متن صاف کہہ رہا ہے: یہاں ایک راز ہے جو آپ بعد میں جان لیں گے۔ اور وہ جان لیا گیا۔

اور زمین میں چلنے والا کوئی جانور نہیں، اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے، مگر

وہ آپ ہی جیسی امتیں ہیں

سورہ انعام – آیت 38

چیونٹیاں



طبقے اور کام

شہد کی مکھی



ملکہ اور کارکن

مہاجر پرندے



قیادت، باری اور راستے

ایسے معاشرے جن میں نظم، رابطہ، تقسیم کار اور تعلیم ہے

جانور بکھرے ہوئے افراد نہیں، بلکہ منظم معاشرے ہیں

آسان لفظوں میں

قرآن نے جانوروں کو «امتیں» کہا – اور امت وہ گروہ ہے جس کا اپنا نظام، اپنی زبان اور اپنی روایات ہوں۔ اور فرمایا کہ وہ «آپ ہی جیسے» ہیں۔ آج سائنس ثابت کرتی ہے کہ جانوروں کے معاشرے نہایت منظم ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدما نے چیونٹیوں اور مکھیوں کی اجتماعی زندگی دیکھی تھی، یہاں تک کہ ارسطو نے انہیں انسان کے ساتھ ایک ہی باب میں رکھا۔ لیکن یہ سب ظاہری بیان رہا، جو پورے کا پورا ایک جامد جبلت کی طرف لوٹا دیا جاتا: نہ سیکھی ہوئی زبان، نہ منتقل ہونے والی ثقافت، نہ علاقائی لہجے۔ اور جانور اور انسان کے درمیان خلیج مطلق تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جانوروں کے طرز عمل کی سائنس نے حقیقی معاشروں کا وجود ثابت کر دیا ہے: چیونٹیوں اور مکھیوں میں کام کی سخت تقسیم؛ وہیل اور ڈولفن کی پیچیدہ رابطہ زبانیں جن کے علاقائی لہجے تک ہیں؛ چمپنزی میں سیکھ کر منتقل ہونے والی ثقافتیں؛ پرندوں میں ہجرت کا نظم اور قیادت کی باری؛ اور پتے کاٹنے والی چیونٹی میں «زراعت» کا نظام تک، جو زمین کے نیچے کھیتوں میں کھمبی اگاتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز دو لفظوں میں ہے۔ «امم»: عربی میں یہ مشترکہ معاملے والا منظم گروہ ہے، محض ریوڑ نہیں۔ اور «امثالکم»: یعنی آپ جیسے اس اعتبار سے کہ وہ اپنے نظام رکھنے والے معاشرے ہیں، نہ کہ عقل اور تکلیف میں آپ جیسے۔ کچھ عرصہ پہلے تک سرکاری سائنس اس سے انکار کرتی تھی کہ جانور کی طرف ثقافت یا زبان منسوب کی جائے، اور اسے غیر سائنسی «انسان انگاری» شمار کرتی تھی – پھر شواہد کے سامنے پیچھے ہٹ گئی۔ رہا یہ جملہ کہ «جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے»، تو یہ ایک قابل توجہ تخصیص ہے، کیونکہ یہ اسے خارج کر دیتی ہے جو دو پروں کے بغیر اڑتا ہے۔

سب سے کمزور گھر... اور مادہ مکڑی

ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا لیے، مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک

گھر بنایا؛ اور بے شک سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے

سورہ عنکبوت – آیت 41



مکڑی کا گھر

- مادہ اکیلی بناتی ہے
- نر نہیں بناتا
- کبھی نر کو کھا جاتی ہے
- اپنے بچے کھا جاتی ہے
- بالکل بے امان گھر

اُس کا دھاگا فولاد سے مضبوط... اور اُس کا گھر سب سے کمزور

کمزوری تار میں نہیں، بلکہ اس «گھر» کے اندر کے رشتوں میں ہے

آسان لفظوں میں

مکڑی کا جو گھر ہم دیکھتے ہیں وہ **بالغ مادہ** بناتی ہے، بالغ نر کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ سب سے کمزور گھر اس لیے نہیں کہ اس کا تار کمزور ہے – بلکہ اس لیے کہ وہ **ایسا گھر ہے جس میں نہ رحم ہے نہ امان**: مادہ اپنے جوڑے اور اپنے بچوں تک کو کھا جاتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مکڑی ہر گھر کی جانی پہچانی مخلوق ہے، اور اس کا جالا کمزوری کی کھلی مثال۔ لیکن بنانے والے میں نر اور مادہ کا فرق، اور جالے کے اندر جو چیر پھاڑ ہوتی ہے، یہ معلوم نہ تھا – یہ ایسی تفصیلات ہیں جو دقیق سائنسی مشاہدے کے بغیر نظر ہی نہیں آتیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شکار کے جو جالے ہم دیکھتے ہیں وہ غالب اکثریت میں **بالغ مادائیں** بنتی ہیں؛ مکڑی کمسنی میں تار بنتی ہے، نر بو یا مادہ، پھر نر بالغ ہو کر بیشتر انواع میں شکاری جالا بنانا چھوڑ دیتا ہے اور مادہ کی تلاش میں آوارہ پھرنے لگتا ہے۔ درجنوں انواع میں مادہ جفتی کے بعد نر کو مار کر کھا جاتی ہے، اور بعض انواع میں بچے اپنی ماں کو کھا جاتے ہیں یا وہ انہیں۔ رہا خود تار، تو وہ معلوم مضبوط ترین مادوں میں سے ہے؛ اپنے وزن کے تناسب سے فولاد سے بھی زیادہ مضبوط۔

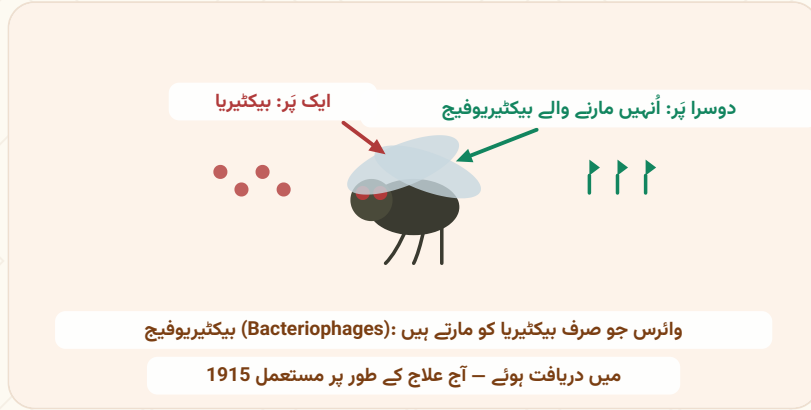
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اگر کمزوری تار کی مضبوطی میں ہوتی تو یہ متن سائنس سے ٹوٹ جاتا، کیونکہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکڑی کا تار فطرت کی سخت ترین چیزوں میں سے ہے۔ لیکن آیت **گھر** کی بات کرتی ہے، تار کی نہیں، اور عربی میں گھر کا مطلب اہل و عیال، سکون اور امان ہے۔ اور سارا سیاق **ایسے بگڑے ہوئے رشتے کے بارے میں ہے جو اپنے صاحب کو کوئی نفع نہیں دیتا**۔ چنانچہ یہ وصف سماجی اعتبار سے دقیق ہے، مادی اعتبار سے نہیں۔ اور اس کی تصدیق یہ ہے کہ فعل مؤنث آیا: «**اتخذت** بیتاً» – اور وہی ہے جو حقیقتاً اسے بناتی ہے، نر نہیں۔

ایک پر میں بیماری اور ایک پر میں دوا

جب آپ میں سے کسی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے پورا ڈبو دے، پھر نکال دے،
کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفا

بخاری نے روایت کیا – صحیح



بیکٹیریوفیج زمین پر سب سے زیادہ تعداد والی مخلوق ہیں، اور ان کا واحد کام بیکٹیریا کو مارنا ہے

آسان لفظوں میں

مکھی جراثیم اٹھاتی ہے – یہ معلوم بات ہے۔ لیکن حدیث کچھ اور کہتی ہے: اس کے ساتھ وہ چیز بھی ہے جو ان جراثیم کو مار ڈالتی ہے۔ اور سائنس نے واقعی ایسی باریک مخلوق دریافت کی جس کا واحد کام بیکٹیریا کا شکار کرنا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بیکٹیریا سرے سے معلوم ہی نہ تھے – وہ 1676 میں لیون ہک کی خوردبین سے پہلی بار دیکھے گئے۔ چنانچہ مکھی کے اٹھائے ہوئے «مرض» کی بات جراثیمی نظریے سے ایک ہزار سال پہلے کی ہے۔ رہا اس کے ساتھ شفا کا ہونا، تو اسے سمجھنے کا کوئی ڈھانچہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

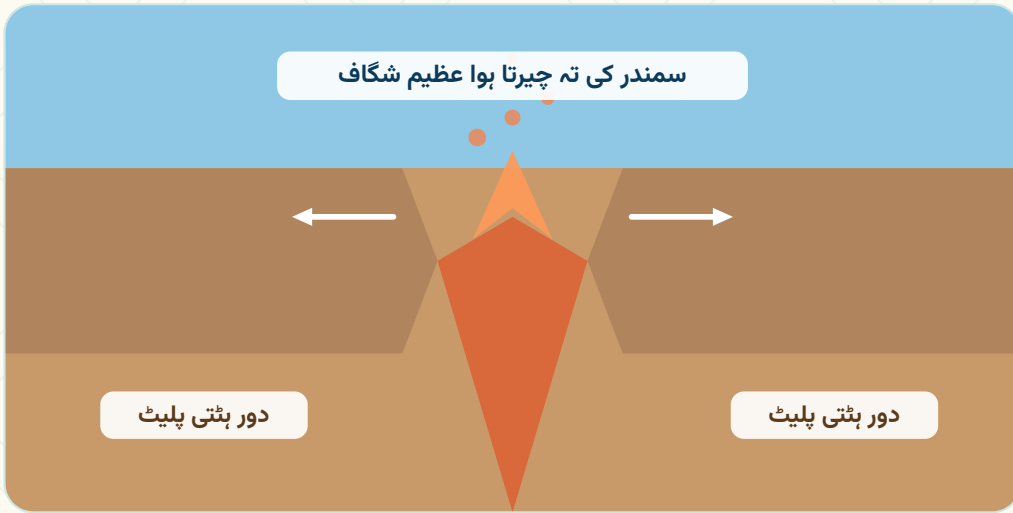
بیکٹیریوفیج (Bacteriophages): ایسے باریک وائرس جو صرف بیکٹیریا کو لگتے اور انہیں مار ڈالتے ہیں؛ انہیں ٹورٹ نے 1915 میں اور دیریل نے 1917 میں دریافت کیا۔ یہ روئے زمین پر سب سے زیادہ تعداد والی مخلوق ہیں، اور وہیں جمع ہوتے ہیں جہاں بیکٹیریا کثرت سے ہوں – یعنی مکھی پر اور اس کے ٹھکانوں میں۔ اور یہ واقعی گھریلو مکھی پر پائے گئے ہیں۔ فیج سے علاج آج ایک قائم شدہ طبی تخصص ہے، جو ان صورتوں میں برتا جاتا ہے جہاں اینٹی بائیوٹک ناکام ہو جائیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حدیث نے صرف دوا کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک عملی ہدایت دی: پورا ڈبونا۔ اور دلالت کی جگہ یہی ہے – کیونکہ ڈبونے کا کوئی مطلب نہیں مگر یہ کہ ضد جراثیم مادے کو کام کرنے کے لیے مائع میں چھوڑا جانا ضروری ہو۔ پھر دو پروں کے درمیان فرق: ایک نقصان اٹھائے ہوئے اور دوسرا علاج۔ یہ ایسی تقسیم نہیں جو بات گھڑنے والے کے ذہن میں آئے؛ متوقع تو یہ تھا کہ کہا جاتا «مکھی میں بیماری بھی ہے اور دوا بھی»۔ رہا ہر ایک کو ایک متعین پر کی طرف منسوب کرنا، تو یہ ایسی تعین ہے جو آزمائی جا سکتی ہے – اور سائنس نے آ کر اس کی تصدیق کر دی۔

قسم ھے لوٹانے والے آسمان کی، اور شگاف والی زمین کی۔

سورہ طارق – آیات 11-12



سمندروں کے نیچے شگافوں کا سلسلہ جو پوری زمین کو گھیرے ہوئے ہے، لمبائی 65 ہزار کلومیٹر

آسان لفظوں میں

زمین کوئی ٹھوس، جڑا ہوا گولا نہیں۔ اُس کی قشر **پھٹی ہوئی** ہے – اُس میں بہت بڑے شگاف ہیں جو پورے سیارے کو گھیرے ہوئے ہیں، اور اُن میں سے گہرائیوں کا پگھلا ہوا پتھر نکلتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

زمین کو ایک ہی ٹھوس، جڑا ہوا جسم سمجھا جاتا تھا۔ رہا پوری زمین کو «شگاف والی» یعنی پھٹی ہوئی کہنا – تو اُس زمانے میں کسی کے تجربے میں اِس کا کوئی مطلب نہ تھا؛ نظر آنے والے شگاف خشک زمین کے چٹخنے یا وادیوں کے نالوں سے آگے نہ تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اِسے «**وسطِ سمندر کا سلسلہ**» (Mid-Ocean Ridge) کہتے ہیں: آتش فشانی شگافوں کا سلسلہ جس کی لمبائی تقریباً 65 ہزار کلومیٹر ہے، جو ٹینس کی گیند کی سلائی کی طرح پورے سیارے کے گرد لپٹا ہے۔ اُس میں سے پگھلا مادہ نکل کر نئی قشر بناتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کی پچاس کی دہائی میں سونار سے دریافت ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں قسم زمین کو ایک **گلی، لازمی صفت** سے موصوف کر رہی ہے: «شگاف والی زمین» – جیسے اُس جگہ کو «درختوں والی» کہا جاتا ہے جس کی طبیعت ہی درخت اگانا ہو۔ یہ کسی عارضی شگاف کی بات نہیں کر رہی، بلکہ شگاف کو خود سیارے کی صفت بنا رہی ہے۔ اور ارضیاتی حقیقت بعینہ یہی ہے: زمین ایک ایسا سیارہ ہے **جس کی قشر فطرتاً پھٹی ہوئی ہے**، اور زلزلوں، آتش فشانوں اور براعظموں کی حرکت کی اصل یہی ہے۔

بھڑکایا ہوا سمندر – پانی کے نیچے آگ

قسم ھے طور کی، اور لکھی ہوئی کتاب کی ... اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی

سورہ الطور – آیات 1-6



زمین کی آتش فشانی سرگرمی کا 80% سے زیادہ حصہ سمندروں کی سطح کے نیچے ہوتا ہے

آسان لفظوں میں

سمندر کے نیچے آگ جل رہی ہے! سمندروں کی تہ میں آتش فشاں اور دراڑیں ہیں جو چار سو درجے کا پانی اُگلتی ہیں۔ تو سمندر **مسجور** ہے – نیچے سے سلگایا ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پانی اور آگ ایسی دو ضدیں ہیں جو جمع نہیں ہو سکتیں – یہ ہر انسان کے نزدیک بدیہی ہے۔ سمندر تو ٹھنڈک اور بجھانے کی علامت ہے۔ سو سمندر کو «مسجور» کہنا سننے والوں کو ایک مبہم تعبیر لگی جس کی حقیقت میں کوئی مثال نہ تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سمندروں کے نیچے ایک عظیم آتش فشانی سلسلہ ہے، اور زمین پر آتش فشانی اخراج کا 80% سے زیادہ پانی کے نیچے ہوتا ہے۔ 1977 میں **آبی حرارتی دراڑیں** دریافت ہوئیں جو 400 درجے سے زیادہ گرم پانی اُچھالتی ہیں، اور شدتِ دباؤ کے سبب وہ اُبلتا نہیں۔ اور ان آگوں کے گرد ایک پوری زندگی ہے جو سورج کی روشنی پر سرے سے انحصار نہیں کرتی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

عربی میں «سَجَرَ» کے معنی ہیں **تنور کو بھڑکانا اور آگ سے بھر دینا** – اِسی سے «وَإِذَا الْبَحَارُ سُجِّرَتْ» ہے۔ تو یہ وصف بھڑکانے میں صریح ہے، نہ بھرنے میں نہ بہنے میں۔ اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی قسم نے قسموں کے ایک سلسلے کو ختم کیا – کوہ طور، لکھی ہوئی کتاب، آباد گھر اور بلند چھت – یعنی یہ حقیقی اور موجود چیزوں کے سیاق میں آئی۔ پس یہ ایک قائم حقیقت کی قسم ہے، جسے انسان نے 1350 برس بعد دریافت کیا۔

مذاق اڑانے والوں سے ہم آپ کے لیے کافی ہیں

بے شک ہم مذاق اڑانے والوں سے آپ کے لیے کافی ہیں ﷺ وہ جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود

ٹھہراتے ہیں — سو عنقریب وہ جان لیں گے

سورہ حجر — آیتیں 95-96

متعین دشمنوں سے کفایت کا وعدہ — اور کفایت ہو گئی



پانچ سردار جن کے نام سیرت میں ہیں... سب ہجرت سے پہلے ہلاک

مکہ میں تمسخر کے سرغنے تھوڑے ہی عرصے میں ایک کے بعد ایک مر گئے

آسان لفظوں میں

مکہ میں کچھ مشہور لوگ تھے جو نبی ﷺ کا مذاق اڑانے میں پیش پیش تھے اور آپ کو ستاتے تھے۔ تب ایک آیت نازل ہوئی جو کہتی تھی: **ہم ان سے آپ کے لیے کافی ہیں۔** اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ سب ہلاک ہو گئے، ہر ایک الگ سبب سے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ لوگ قریش کے سرداروں اور جاہ و مال والوں میں سے تھے، اور اپنی قوت اور اثر کے عروج پر تھے۔ اور نبی ﷺ اور آپ کے ساتھی سب سے کمزور حال میں: گھیرے ہوئے، ستائے ہوئے، نہ ان کے پاس کوئی لشکر تھا اور نہ کوئی پناہ۔ اور ان کی اذیت روکنے کا بھی کوئی انسانی ذریعہ نہ تھا، چہ جائیکہ انہیں ہلاک کرنے کا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سیرت اور تاریخ کی کتابیں — اور ان میں سب سے قدیم ابن اسحاق کی سیرت بروایت ابن ہشام — بتاتی ہیں کہ تمسخر کے سرغنے پانچ تھے، اور وہ سب ہجرت سے پہلے یا اس کے آس پاس ایک ہی قریبی مدت میں ہلاک ہو گئے، ایسے مختلف اسباب سے جن میں کوئی قدر مشترک نہیں: ایک بیماری، ایک وبا، ایک حادثہ، ایک کانٹا جو چبھ گیا، اور ایک زخم جو سڑ گیا۔ اور ان میں سے کوئی ایسا باقی نہ رہا جو اس کے بعد دعوت کی مخالفت کرتا۔

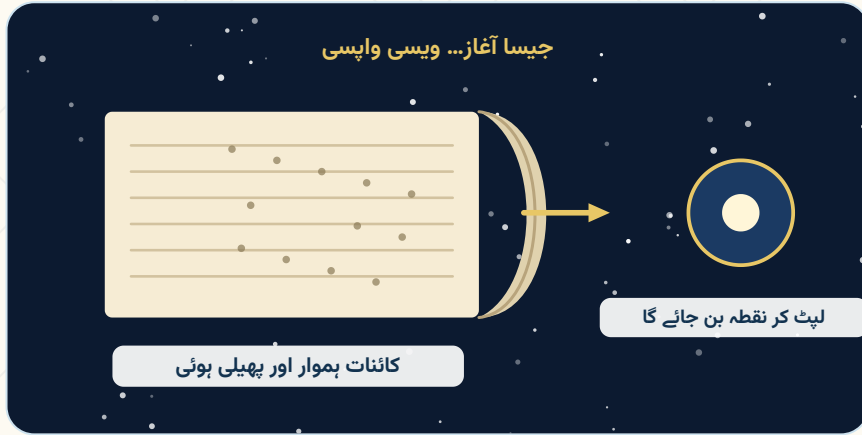
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

متن میں **ایک ضمانت** ہے، محض کوئی دعا یا امید نہیں۔ اور ضمانت ایسا التزام ہے جس کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے، اور پھر اس کا کہنے والا فوراً اپنے مخالفوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان میں سے ایک بھی برسوں سنتا اور مذاق اڑاتا رہتا تو آیت ان کے حق میں نہیں، ان کے خلاف حجت بن جاتی۔ اور اس سے بھی اہم بات: یہ وعدہ **شہر کے سب سے طاقتور لوگوں کے خلاف، سب سے کمزور کے حق میں** دیا گیا — اور یہ ایک ایسا انداز ہے جو پورے قرآن میں دہرایا جاتا ہے: «عنقریب یہ جتھا شکست کھائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا» مکہ میں بدر سے برسوں پہلے نازل ہوئی، اور نبی ﷺ نے بدر کے دن اسے پڑھا، تو وہ واقع ہو گئی۔

آسمان کاغذ کی طرح لپٹ جائے گا

جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جیسے لکھے ہوئے طومار لپیٹے جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے پہلی بار خلق کا آغاز کیا، ویسے ہی اُسے دہرائیں گے

سورہ انبیا – آیت 104



کائنات ایک نقطے سے پھیلی... اور لپٹ کر ایک نقطے ہی کی طرف لوٹ جائے گی

آسان لفظوں میں

آیت کہتی ہے کہ کائنات کا انجام ایک **لپیٹ** ہوگا – یعنی سکڑنا اور لپٹنا، جیسے آپ کاغذ کا ایک ورق لپیٹتے ہیں۔ پھر وہ ایک عجیب بات کہتی ہے: یہ انجام بالکل **آغاز جیسا** ہوگا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُفق پر «کائنات کا خاتمہ کیسے ہوگا؟» نام کا کوئی سوال ہی نہ تھا، کیونکہ لوگوں کے گمان میں کائنات ازلی اور ابدی تھی، نہ اُس کی کوئی ابتدا نہ کوئی انتہا۔ اور انجام کی شکل کو آغاز کی شکل سے جوڑنے کے لیے کوئی ایسا ڈھانچہ سرے سے تھا ہی نہیں جس میں یہ بات سمجھ آتی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نظری طبیعیات میں کائنات کے انجام کے سب سے مشہور منظرناموں میں سے ایک «**عظیم سکڑاؤ**» (Big Crunch) ہے: کشش پھیلاؤ پر غالب آ جاتی ہے، تو کائنات اپنے ہی اوپر سکڑتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے – انتہائی کثافت والا ایک نقطہ۔ یعنی **انجام آغاز کی الٹی تصویر ہے**۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز یہاں آیت کے دوسرے نصف میں ہے: «جیسے ہم نے پہلی بار خلق کا آغاز کیا، ویسے ہی اُسے دہرائیں گے»۔ یہ جملہ ایک قاعدہ طے کر دیتا ہے: **انجام کی شکل = آغاز کی شکل**۔ اور اِس طرح یہ ہمیں ضمناً بتا دیتا ہے کہ کائنات اپنے آغاز میں **لپٹی ہوئی** تھی – یعنی ایک نقطے میں سمٹی ہوئی – اور یہی عین وہ بات ہے جو عظیم دھماکے کا نمونہ کہتا ہے۔ ایک ہی آیت نے آغاز اور انجام دونوں دے دیے، اُس زمانے میں جب کسی کے ذہن میں کائنات کی نہ کوئی ابتدا تھی نہ کوئی انتہا۔

وہ ستارہ جو دستک دیتا اور چھید ڈالتا ہے

قسم ہے آسمان کی اور رات کے آنے والے کی ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور آپ کیا جانیں کہ رات کا آنے والا کیا ہے؟

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ چھید ڈالنے والا ستارہ

سورہ طارق – آیات 1-3



نبض دار ستارہ ایسی باقاعدہ نبضیں بھیجتا ہے جیسے ہتھوڑے کی ضربیں جو کبھی نہیں چوکتیں

آسان لفظوں میں

کچھ ستارے ایسے اشارے بھیجتے ہیں جیسے **دروازے پر باقاعدہ دستکیں ہوں**: ٹھک... ٹھک... ٹھک... اُس گھڑی سے بھی زیادہ ٹھیک جو انسان نے کبھی بنائی ہے۔ اور قرآن نے اُسے «الطَّارِق» کہا – یعنی وہ جو دستک دیتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک ستارہ روشنی کا ایک خاموش، ساکن نقطہ تھا۔ نہ اُس کی کوئی آواز، نہ نبض، نہ کوئی چھید۔ اور لفظ «طَّرِق» – یعنی بار بار آواز کے ساتھ ضرب لگانا – کو آسمان کے کسی ستارے سے جوڑنا، اُس زمانے کے کسی سننے والے کے لیے بے معنی بات تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

1967 میں ماہر فلکیات جوسلین بیل نے خلا سے ایسے ریڈیائی اشارے پکڑے جو حیران کن باقاعدگی کے ساتھ دہرائے جا رہے تھے، یہاں تک کہ ٹیم نے پہلے انہیں ذہین مخلوقات کے پیغام سمجھا اور اُن کا نام LGM-1 رکھ دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ **نبض دار نیوٹران ستارے** (Pulsars) ہیں: پھٹ چکے ستاروں کی باقیات، جو تقریباً ہر سیکنڈ اپنے گرد ایک چکر لگاتے ہیں – اور اُن میں سب سے تیز ایک سیکنڈ میں سیکڑوں بار – اور دو شعاعیں چھوڑتے ہیں جو مینارہ نور کی طرح خلا کو جھاڑتی ہیں۔ اور جب اُن کے اشارے آواز میں بدلے گئے تو وہ بالکل **ایک باقاعدہ دستک** تھے۔

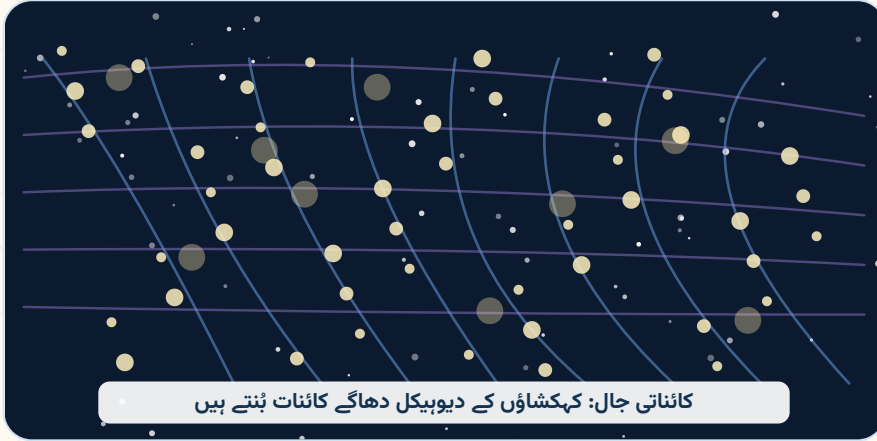
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دونوں لفظ مل کر کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے: «الطَّارِق» = وہ جو بار بار دستک کی آواز پیدا کرے، اور «الطَّاقِب» = وہ جو چیر کر پار نکل جائے۔ اور نبض دار ستارہ دونوں وصف لفظاً جمع کر دیتا ہے: اُس کے اشارے ایک باقاعدہ دستک ہیں، اور وہ ہزاروں نوری سال چیر کر کہکشاں کی گرد کے پار ہم تک پہنچتے ہیں۔ بلکہ خود قسم کے بعد ایک استفہامی جملہ آیا: «اور آپ کیا جانیں کہ طارق کیا ہے؟» – یعنی یہ ایسی چیز ہے جس کے جاننے کا کوئی راستہ آپ کے پاس نہیں۔ اور ایسا ہی رہا، 1967 تک۔

بُنے ہوئے راستوں والا آسمان

قسم ہے راستوں والے بُنے ہوئے آسمان کی

سورہ ذاریات – آیت 7



کائناتی جال: کہکشاؤں کے دیوبیکل دھاگے کائنات بُنتے ہیں

کائنات کا عظیم نقشہ: بکھری ہوئی کہکشائیں نہیں، بلکہ دھاگوں اور گرہوں کا بُنا ہوا جال

آسان لفظوں میں

اگر آپ پوری کائنات کو بہت دور سے دیکھیں تو آپ کو بکھرے ہوئے ستارے نظر نہیں آئیں گے۔ آپ کو کچھ ایسا نظر آئے گا جیسے بُنا ہوا کپڑا یا دھاگوں کا جال: کہکشاؤں کے لمبے لمبے دھاگے، اور اُن کے بیچ بہت بڑے کالے خلا۔ اور عربی میں «الْحُبْك» کا معنی ہے: وہ مضبوط بُنائی جس میں راستے ہوں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک آسمان ایک ہموار گنبد تھا جس میں روشنی کے نقطے جڑے ہوئے تھے، نہ کوئی ساخت، نہ شکل، نہ ترتیب۔ کائنات کی کوئی «مجموعی شکل» بھی ہو، یہ خیال تو زیرِ بحث ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پچھلی چند دہائیوں میں رصد گاہوں نے لاکھوں کہکشاؤں کے سہ ابعادی نقشے تیار کیے (SDSS منصوبہ اور 2dF سروے)، تو حیران کن نتیجہ سامنے آیا: کہکشائیں بے ترتیب بکھری ہوئی نہیں، بلکہ «کائناتی جال» (Cosmic Web) کی صورت میں مرتب ہیں – کہکشاؤں کے دیوبیکل دھاگے اور دیواریں جو بہت بڑے خالی خلاؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور جو تصویر بنتی ہے وہ حیرت انگیز حد تک ایک بُنے ہوئے کپڑے سے ملتی ہے۔

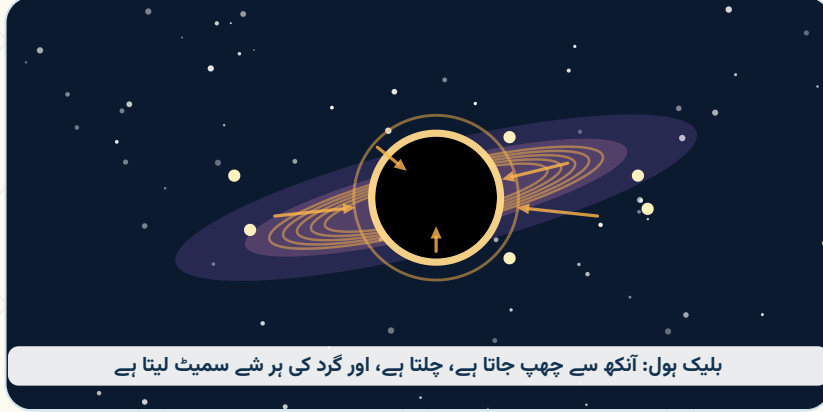
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

«الْحُبْك» «جَبَاک» کی جمع ہے، اور عربی لغات میں اس کا معنی ہے: کسی مضبوطی سے بُنی ہوئی چیز میں ایک دوسرے میں پیوست راستے، جیسے پانی پر لہروں کا نشان یا ریت پر پڑی سلوٹیں۔ اور آج جو سائنسی اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ بالکل یہی ہے: «Filaments» یعنی دھاگے۔ چودہ صدیوں بعد ایک عربی لفظ کا جدید سائنسی اصطلاح کے ساتھ ایسے نادر اور مخصوص معنی میں مل جانا، اُن چیزوں میں سے نہیں جو اتفاقاً ہوتی ہیں۔

پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے، جھاڑنے والے

❖ پس قسم ہے پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والوں کی ﴿جہپ﴾ جو چلتے ہیں اور جھاڑ ڈالتے ہیں ❖

سورہ تکویر – آیات 15-16



بلیک ہول: آنکھ سے چھپ جاتا ہے، چلتا ہے، اور گرد کی ہر شے سمیٹ لیتا ہے

بلیک ہول اپنے گرد کی گیس اور ستارے کائناتی جھاڑو کی طرح نگل لیتا ہے

آسان لفظوں میں

خلا میں کچھ اجسام ایسے ہیں جن میں تین صفتیں ہیں: وہ **چھپ جاتے ہیں** اور دکھائی نہیں دیتے، وہ زبردست رفتار سے **چلتے ہیں**، اور اپنے گرد جو کچھ ہے اُسے **جھاڑ کر** نگل لیتے ہیں۔ یہی تینوں صفتیں ہیں جن کی اللہ یہاں قسم کھا رہا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پوری دنیا میں کسی **غیر مرئی** آسمانی جسم کا تصوّر تک نہ تھا۔ جسم یا تو نظر آتا ہے تو موجود ہے، یا نظر نہیں آتا تو موجود نہیں۔ رہا یہ کہ آسمان میں کوئی بہت بڑی چیز ہو جسے کوئی آنکھ کبھی نہ دیکھے، اور وہ اپنے گرد کی ہر چیز نگلتی جائے – اس کا تو کسی نے تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سیاہ شگاف (بلیک ہول): ایسے اجسام جن کی کثافت اِس قدر ہے کہ روشنی تک اُن سے نکل نہیں پاتی، چنانچہ وہ اپنی فطرت ہی سے **بالکل پوشیدہ** ہیں۔ وہ اپنی کہکشاؤں میں گھومتے اور چلتے ہیں، اور گیس، گرد اور ستاروں کو کھینچ کر نگل لیتے ہیں۔ پہلے بلیک ہول کی براہ راست تصویر 2019 میں لی گئی (کہکشاں M87 میں)، اور اُن کے ثبوت پر کام کو 2020 میں نوبل انعام ملا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تینوں لفظ حیران کن حد تک دقیق ہیں: «الْحُتْس» «خُنْس» سے ہے، یعنی **چھپ گیا اور سمٹ گیا**؛ «الْجَوَارِ» یعنی **چلنے والے، حرکت میں رہنے والے**؛ «الْكَتْس» «كَتْس» سے ہے، یعنی **اپنے گرد کی چیزیں سمیٹ کر نگل لینا** (اسی سے «مِکْتَس» یعنی جھاڑو ہے، اور اسی سے «کِناس» ہے، وہ بھٹ جس میں ہرن چھپ جاتا ہے)۔ دو آیتوں میں تین صفتیں، اور تینوں ایک ہی ایسی چیز پر صادق آتی ہیں جو بیسویں صدی سے پہلے معلوم ہی نہ تھی۔ اور یہ بھی دیکھیے کہ قرآن میں قسم کسی عظیم چیز ہی کی کھائی جاتی ہے۔

ماخذ Event Horizon Telescope (2019) – the first image of M87* · Nobel Prize in Physics 2020

زمین اپنے بوجھ نکال دیتی ہے

❖ جب زمین اپنے بھونچال سے ہلا دی جائے گی، اور زمین اپنے بوجھ نکال باہر ڈالے گی

سورہ الزلزال – آیات 1-2



زلزلوں اور زمینی تہوں کی حرکت ہی نے دھاتوں اور تیل کو ہماری پہنچ تک اٹھایا

آسان لفظوں میں

آج ہم جو سونا، دھاتیں اور تیل نکالتے ہیں وہ سب زمین کی گہرائیوں میں دفن تھے۔ اور انہیں سطح کے قریب لانے والی چیز **زلزلے اور زمین کی حرکت** ہے، لاکھوں برسوں کے دوران۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

زلزلہ سراسر آفت تھا: عمارتوں کا گرنا، زمین کا دھنسنا اور موت۔ کسی نے اسے کسی فائدے سے یا کوئی بھلائی نکالنے سے نہ جوڑا۔ اور «اثقالہا» یعنی زمین کے باطن کے خزانے — یہ مفہوم سننے والوں کے ہاں واضح ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

دنیا کی بیشتر معاشی کانیں **زمینی تہوں کے کناروں** اور زلزلے و آتش فشانی سرگرمی کے علاقوں میں واقع ہیں۔ تہوں کی حرکت ہی دھات سے بھری چٹانوں کو گہرائی سے قشر تک دھکیلتی ہے، اور گرم سیال ہی سونے اور تانبے کو رگوں میں مرتکز کرتے ہیں۔ اگر یہ سرگرمی نہ ہوتی تو زمین کے سارے خزانے ہمیشہ کے لیے ہماری پہنچ سے دور رہتے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

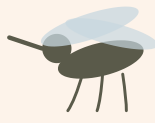
آیت دو ایسے واقعوں کو جوڑتی ہے جنہیں عام عقل نہیں جوڑتی: زلزلہ ← بوجھوں کا نکلنا۔ اور یہی وہ بات ہے جو علمِ کان کنی طے کرتا ہے۔ اور لفظ «اثقال» حیرت انگیز حد تک باریک ہے: قیمتی دھاتیں — جیسے سونا اور پلاٹینم — **عناصر میں سب سے زیادہ کثیف** ہیں، اور لوہے کے ساتھ گہری وابستگی رکھتی ہیں، سو جس دن زمین کی تہیں الگ ہوئیں یہ لوہے کے پیچھے اس کے مرکز تک اتر گئیں اور قشر کو اپنے آپ سے تقریباً خالی چھوڑ گئیں؛ اب یہ ہم تک اسی طاقت سے پہنچتی ہیں جو انہیں اوپر اٹھائے۔ سو انہیں اُسی طبیعی خاصیت کے نام سے پکارا گیا جو انہیں سب سے ممتاز کرتی ہے۔

مچھر، اور جو اس سے آگے ھے

ھے شک اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی مثال بیان کرے — مچھر کی، یا جو اس سے بھی آگے ھو

سورہ بقرہ — آیت 26

جو اس سے آگے ھے = جو اس سے چھوٹا ھے



مچھر

نظر آنے والی سب سے چھوٹی چیز



وائرس

اس سے دس لاکھ گنا چھوٹا



بیکٹیریا

ان کے بیچ

بیکٹیریا اور وائرس کے مقابلے میں مچھر ایک دیو ھے

آسان لفظوں میں

قرآن نے سب سے چھوٹی چیز کی مثال دی جو لوگ دیکھتے ہیں — مچھر — پھر فرمایا: «فما فوقها»۔ اور عربی میں «فوق» چھوٹائی میں اور بڑھ جانے کے معنی میں بھی آتا ھے، یعنی: اور جو اس سے بھی چھوٹا ھو۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مچھر ممکنہ چھوٹائی کی حد تھا: سب سے چھوٹی مخلوق جسے آنکھ دیکھ سکے اور اس کے اعضا میں امتیاز کر سکے۔ اس سے چھوٹی زندگی کا تصور ہی نہ تھا، کیونکہ جو نظر نہ آئے اس کا وجود معلوم نہیں ہوتا۔ اور معاملہ اسی طرح رہا یہاں تک کہ خوردبین ایجاد ہوئی۔

آج سائنس کیا کہتی ھے؟

مچھر نسبتاً ایک بڑی مخلوق ھے: اس کی لمبائی تقریباً 6 ملی میٹر ھے۔ اکیلے اس کے جسم میں لاکھوں بیکٹیریا بستے ہیں، اور اس پر ایسے وائرس ہیں جو بیکٹیریا سے سیکڑوں گنا چھوٹے ہیں۔ اور ایک ہی مچھر کی ساخت نہایت پیچیدہ نکلی: سیکڑوں عدسوں والی مرکب آنکھ، ایک سوئڈ جس میں چھیدنے، چوسنے اور خون جمنے سے روکنے والا مادہ داخل کرنے کے لیے چھ الگ آلات ہیں، اور ایسے پر جو ایک سیکنڈ میں 600 بار پھڑپھڑاتے ہیں۔

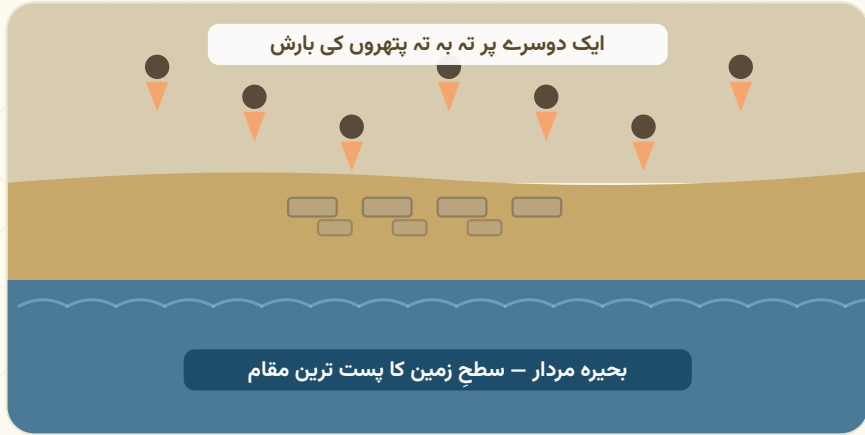
یہ قطعی معجزہ کیوں ھے؟

سیاق ہی فیصلہ کن ھے۔ آیت اس مقام پر ھے کہ اللہ چھوٹی چیز سے مثال دینے میں نہیں شرماتا، ان لوگوں کے جواب میں جنہوں نے مکھی اور مکڑی کے ذکر کا مذاق اڑایا تھا۔ چنانچہ سیاق سے ہم آہنگ معنی یہ ھے: اور نہ اس سے جو چھوٹائی میں اس سے بھی بڑھ کر ھو۔ اور یہ استعمال صحیح عربی ھے، جیسے کہا جاتا ھے «یہ جہالت میں اس سے بھی فوق ھے»۔ چنانچہ متن ضمناً ایسی مخلوقات کے وجود کو ثابت کرتا ھے جو سب سے چھوٹی نظر آنے والی چیز سے بھی چھوٹی ہیں، ایسے زمانے میں جب مچھر چھوٹائی کے بارے میں انسانی علم کی حد تھا۔

قوم لوط... جس کا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا گیا

سو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اُس کا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا، اور اُس پر تہ
بہ تہ پکی مٹی کے پتھر برسائے

سورہ ہود — آیت 82



ایک علاقہ جو دھنسا اور اُلٹ گیا، اور اُسے سخت کھارے پانی نے ڈھانپ لیا

آسان لفظوں میں

آیت کہتی ہے کہ قوم لوط کا شہر اُلٹ کر اوندھا ہو گیا، پھر اُس پر ایسے پتھر برسے جو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ جمے ہوئے تھے۔ اور ارضیات بتاتی ہے کہ یہ اُسی علاقے میں کیسے پیش آتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دھنسنے اور اُلٹ جانا محض غیبی سزا سمجھا جاتا تھا، جس کے پیچھے کوئی قدرتی سبب نہ ہو۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ وہ علاقہ ایک بہت بڑے زمینی شگاف پر واقع ہے، نہ یہ کہ اُس کے اندر گیسیں، تارکول اور گندھک ہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بحیرہ مردار کا علاقہ بحیرہ مردار کے تحوّل شگاف پر واقع ہے — دنیا کے سب سے زیادہ زلزلہ خیز شگافوں میں سے ایک — اور یہ کرۂ ارض کی خشکی کا سب سے نیچا مقام ہے۔ اور یہ علاقہ قدرتی تارکول، گندھک اور آگ پکڑنے والی گیسوں سے بھرپور ہے۔ اور محققین نے یہ رائے دی ہے کہ ایک شدید زلزلے نے مٹی کے سیال ہو جانے اور دھنسنے اور اُس کی تہوں کے اُلٹ جانے کو جنم دیا، ساتھ ہی جلتے ہوئے مادے اُچھلے جو اُس علاقے پر آ گئے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

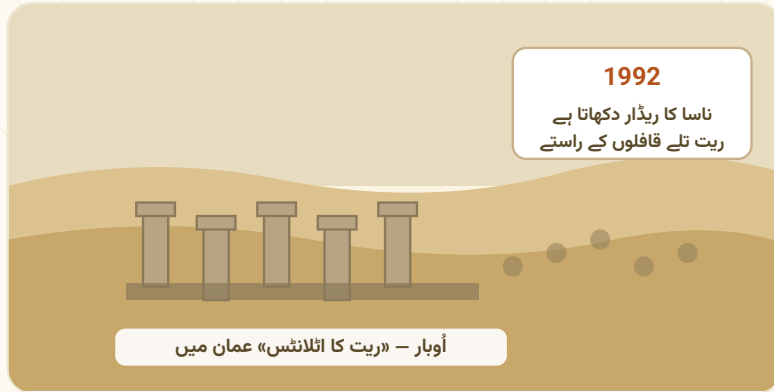
تین لفظ سارا وصف اُٹھائے ہوئے ہیں۔ «ہم نے اُس کا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا»: تہوں کا مکمل عمودی اُلٹ جانا، محض ڈھا دینا نہیں — اور ارضیات میں دھنسنے اور اُلٹنے کا بیان یہی ہے۔ اور «سجّیل»: ایک ایسا لفظ جو پتھر اور سخت ہو جانے والی مٹی دونوں کو جمع کرتا ہے۔ اور «منضود»: یعنی ایک دوسرے پر تہوں میں جما ہوا — اور یہ اُس علاقے کی تہ دار رسوبی چٹان کا باریک بیان ہے۔ سو یہ متن ایک ہم آہنگ قدرتی سبب بیان کر رہا ہے، کوئی مبہم خیالی تصویر نہیں۔

اِرم، ستونوں والی... دفن شدہ شہر

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا اِرم، ستونوں والی جس کے

مانند شہروں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا

سورہ فجر – آیات 6-8



اونچے میناروں والا ایک قلعہ جو ہزاروں سال بعد رُبع الخالی کے ریت کے ٹیلوں کے نیچے سے نکلا

آسان لفظوں میں

قرآن نے ایک عظیم شہر کا ذکر کیا جو **ستونوں** والا تھا اور جس کے مانند کوئی نہ بنایا گیا، اور کہا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اور لوگ اُسے افسانہ سمجھتے رہے... یہاں تک کہ سیاروں کے ریڈار نے رُبع الخالی کی ریت کے نیچے ایک دفن شدہ آبادی ظاہر کر دی جس کے چھپے ہوئے کسی کو گمان نہ تھا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

رُبع الخالی میں بے انتہا ریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور مغربی مؤرخین «عاد» اور «اِرم» کو عربوں کے افسانوں میں شمار کرتے تھے، کیونکہ اُن کا نہ کوئی نشان تھا نہ دوسرے مصادر میں کوئی ذکر۔ اور صحرا کوئی ایسا راز نہیں سنہالتا جو اُس کی سطح سے دکھائی دے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سن 1992 میں نکولس کلپ کی قیادت میں ایک ٹیم نے ناسا کے خلائی شٹل کے ریڈار کی تصویریں استعمال کیں، تو ریت کے نیچے **قدیم قافلوں کے راستے ظاہر ہوئے جو ایک ہی نقطے پر آ ملتے ہیں**، عمان کے صوبہ ظفار میں **الشصر** کے مقام پر۔ اور کھدائی سے ایک آٹھ پہلو قلعہ نکلا جس کے **اونچے مینار** تھے، اور ایک ایسے شہر کے آثار جو اپنے نیچے ایک چوٹے کے گڑھے میں دھنس گیا تھا۔ اور عالمی اخبارات نے یہ خبر «اُوبار: ریت کا اٹلانٹس» کے نام سے شائع کی۔ مگر یہ اخباری سرخی ہے، ماہرین آثار کا فیصلہ نہیں؛ کیونکہ الشصر کا خود اِرم کے ساتھ تعلق ثابت نہیں ہوا، اور قرآن نے جس شہر کا ذکر کیا اُس کی جگہ آج بھی نامعلوم ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قرآنی وصف نے اِس شہر کو ایک خاص صفت کے ساتھ خاص کیا: «**ستونوں والی**» – یعنی اونچے ستون یا مینار۔ اور یہ کسی بھی شہر کی عام صفت نہیں؛ جزیرہ عرب کے شہر تو مٹی کے گھر اور خیمے تھے۔ پھر مزید کہا: «**جس کے مانند شہروں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا**» – یعنی اُس کا تعمیری تفرد۔ اور ریت کے نیچے سے واقعی اونچے مینار نکلے، اگرچہ ابھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ الشصر ہی اِرم ہے۔ اور سب سے اہم یہ کہ قرآن نے اُس کا ذکر **ایک واقعی تاریخ** کے طور پر کیا، افسانے کے طور پر نہیں، ایسے وقت میں جب کسی کے پاس اُس کی کوئی دلیل نہ تھی، اور یہ بات 14 صدیوں تک اُس پر اعتراض بنی رہی، یہاں تک کہ ریڈار آ گیا۔



دوسرا باب

نبی ﷺ کی وہ پیشین گوئیاں جو پوری ہوئیں



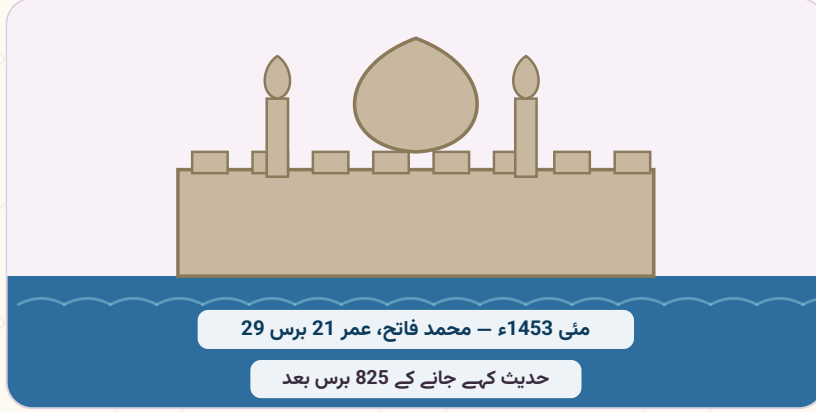
وہ خبریں جو آپ ﷺ نے ایک دور کے مستقبل کے بارے میں دیں، آپ کے صحابہ نے اپنی کتابوں میں لکھ لیں، پھر وہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے بعینہ ویسے ہی پیش آئیں جیسے آپ نے فرمایا تھا؛ حرف بہ حرف۔

19 دلائل

قسطنطنیہ ضرور فتح ہوگا

قسطنطنیہ ضرور فتح ہوگا، تو کیا ہی اچھا امیر ہوگا اس کا امیر، اور کیا ہی اچھا لشکر ہوگا وہ لشکر

احمد اور بخاری نے تاریخ میں روایت کیا – ایک جماعت نے صحیح قرار دیا



مئی 1453ء – محمد فاتح، عمر 21 برس 29

حدیث کہے جانے کے 825 برس بعد

قسطنطنیہ: قدیم دنیا کا سب سے ناقابلِ تسخیر قلعہ بند شہر

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے فرمایا کہ **قسطنطنیہ فتح ہوگا**، اور اس امیر اور اس کے لشکر کی تعریف کی جو اسے فتح کرے گا۔ اور آٹھ صدیوں سے زیادہ بعد سلطان محمد فاتح نے اسے فتح کر لیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قسطنطنیہ زمین کی سب سے طاقتور نصرانی سلطنت کا دارالحکومت تھا، اور بلا استثنا سب سے زیادہ قلعہ بند شہر: تین تہوں والی عظیم فصیلیں، ایک خلیج جو لوہے کی زنجیر سے بند کر دی جاتی تھی، اور تین طرف سے گھیرتا ہوا سمندر۔ وہ صدیوں کے دوران بیس سے زیادہ محاصروں کے سامنے ڈٹا رہا۔ اور کہنے والا اس دن مدینہ منورہ میں تھا، اور اس کی ریاست کے پاس بحری بیڑہ سرے سے تھا ہی نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

29 مئی 1453ء کو سلطان محمد ثانی نے اسے فتح کیا، اس وقت ان کی عمر اکیس برس تھی، اور اسی لیے «فاتح» کا لقب پایا۔ انہوں نے ایسی دیو ہیکل توپ استعمال کی جس کی مثال نہ دیکھی گئی تھی، اور زنجیر سے بچنے کے لیے اپنے جہاز خشکی پر سے گزاریے، چربی لگے تختوں پر۔ یہ واقعہ عالمی تاریخ کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے، اور اسی سے قرونِ وسطیٰ کے خاتمے کی تاریخ لی جاتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حدیث صرف فتح کی خبر دینے پر نہیں رکی، بلکہ **فاتح اور اس کے لشکر کی پیشگی تعریف کی** – اور اس سے خطرہ بڑھ جاتا ہے، کیونکہ یہ متن کی سچائی کو ایسے آدمی کی صفت سے باندھ دیتی ہے جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اور مسلمان سپہ سالار آٹھ صدیوں تک اس شرف پر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے: معاویہ اور سلیمان بن عبدالملک نے اس کا محاصرہ کیا، اور ہارون الرشید کا لشکر 165 ہ میں اس کی خلیج تک پہنچا مگر پار نہ اترا، اور کوئی اسے فتح نہ کر سکا – اور ہر ناکام کوشش حدیث کو جھٹلانے کا موقع تھی، سچا ثابت کرنے کا نہیں۔ پھر فتح اکیس برس کے ایک نوجوان کے ہاتھوں ہوئی، ایسی تدبیر سے جس کا تصور بھی نہ تھا۔

کسریٰ ہلاک ہوا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں

جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا، اور جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا، اور اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ان دونوں کے خزانے ضرور اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے

بخاری اور مسلم نے روایت کیا – متفق علیہ

کہا گیا جب وہ قوت کے عروج پر تھے

فارس اور روم حکمران ہیں
معلوم دنیا کے نصف پر
اور مسلمان مدینہ میں
نوزائیدہ ریاست – بے مال

اور جیسا کہا ویسا ہوا

یزدگرد، آخری کسریٰ
فارس مٹ گئی، پھر نہ لوٹی
اور روم نے شام و مصر کھو دیے
اور ان کے خزانے بیت المال میں

کہنے اور واقع ہونے کے بیچ: تیس سال سے کم

دو سلطنتیں جنہوں نے صدیوں حکومت کی... ایک ختم ہو گئی اور دوسری سکڑ گئی

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے فرمایا کہ **فارس کا بادشاہ مر جائے تو اس کے بعد اس جیسا بادشاہ نہ آئے گا**، اور اسی طرح روم کا بادشاہ، اور یہ کہ ان دونوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ ہوں گے۔ اور یہ سب واقع ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

فارس اور روم بلا نزاع دنیا کی دو عظیم ترین طاقتیں تھیں، مشرق و مغرب آپس میں بانٹے ہوئے، اور ان کے لشکر اور خزانے بے شمار تھے۔ اور مسلمان اس دن مدینہ میں ایک چھوٹی سی جماعت تھے، نہ ان کی کوئی ریاست، نہ لشکر، نہ خزانے، انہی دو عظیم سلطنتوں کے درمیان گھرے ہوئے۔ اور اسی حال میں یہ بات کہی گئی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ساسانی سلطنت 651ء میں **یزدگرد سوم** کے قتل کے ساتھ ہمیشہ کے لیے گر گئی، اور اس کے بعد فارس میں کبھی کوئی بادشاہ اس لقب کے ساتھ کھڑا نہ ہوا۔ رہے روم، تو ان کی ریاست فوراً ختم نہ ہوئی، لیکن اس نے **شام، مصر اور شمالی افریقہ کھو دیے** اور سکڑ گئی، اور قیصر کا ان ملکوں پر پھر کوئی اقتدار نہ رہا۔ اور کسریٰ کے خزانے عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مدینہ لائے گئے اور تقسیم کیے گئے، یہاں تک کہ انہوں نے فرمایا: «جن لوگوں نے یہ ادا کیا وہ واقعی امانت دار ہیں»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دونوں جملوں کے باریک فرق پر توجہ کیجیے۔ کسریٰ کے بارے میں کہا گیا: «اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں» – اور **فارس بالکل ختم ہو گیا**۔ اور قیصر کے بارے میں اسی جیسی بات کہی گئی – اور **روم ختم نہ ہوا بلکہ سکڑ گیا**، اسلام کی سرزمینوں سے۔ اور یہ حدیث کے سیاق سے ہم آہنگ ہے: بات تو اسی کی ہے جو اس زمین پر حکومت کرتا اور اس میں جھگڑتا ہے۔ اور اس سے بھی دقیق بات یہ ہے کہ حدیث نے محور **خزانوں کو بنایا، زمین کو نہیں**: «ان دونوں کے خزانے ضرور اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے» – اور یہی وہ جملہ ہے جس پر قسم کھائی گئی۔ زمین کے دو امیر ترین بادشاہوں کے مال کا وعدہ، ایسے آدمی کی طرف سے جسے اپنا شام کا کھانا میسر نہیں۔

عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا

عمار پر افسوس، اسے باغی گروہ قتل کرے گا؛ وہ انہیں جنت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اسے آگ کی طرف بلاتے ہیں

بخاری اور مسلم نے روایت کیا - متفق علیہ

مدینہ کی مسجد کی تعمیر کے دوران کہا گیا - 1 ہ

سنہ 1 ہجری

سنہ 37 ہجری

36 سال

عمار اینٹیں ڈھو رہے ہیں

صفین میں شہید ہوئے

جس دن پیش آیا، حدیث دونوں گروہوں کے بیچ فیصلہ کن حجت بنی

یہاں تک کہ اسی معرکے میں اس سے حجت پکڑی

ہجرت کے پہلے سال کہی گئی ایک پیش گوئی، جو چھتیس سال بعد پوری ہوئی

آسان لفظوں میں

جس وقت وہ مسجد بنا رہے تھے، نبی ﷺ نے عمار بن یاسر کے بارے میں فرمایا کہ **انہیں ایک ظالم گروہ قتل کرے گا**۔ اور چھتیس سال بعد عمار جنگ صفین میں شہید ہوئے - تو لوگوں نے جان لیا کہ باغی کون ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ بات اس وقت کہی گئی جب مسلمان مدینہ میں اپنے ابتدائی عہد کی ایک ہی باہم محبت کرنے والی جماعت تھے، نہ ان میں کوئی فتنہ تھا نہ کوئی تقسیم، اور ہر ایک اپنے ہاتھ سے مسجد بنا رہا تھا۔ اور یہ خیال کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے، اور ایک جلیل القدر صحابی مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوں گے، کسی کے دل میں آنے والی سب سے دور کی بات تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عمار بن یاسر 37 ہ میں جنگ صفین میں شہید ہوئے، اس وقت ان کی عمر نوے برس کے قریب تھی، اور وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی صف میں تھے۔ اور **شام کا لشکر سخت اضطراب میں پڑ گیا جب معلوم ہوا کہ وہ شہید ہو گئے**، کیونکہ حدیث ان کے درمیان معروف اور زبان زد تھی۔ اور حدیث صحیحین میں مخرج ہے، اور صحابہ کی ایک جماعت سے اتنے راستوں سے مروی ہے کہ تواتر تک پہنچ گئی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس پیش گوئی میں سب سے زور دار بات یہ ہے کہ **دونوں متنازع فریق اسے جانتے تھے اور اس سے استدلال کرتے تھے** - چنانچہ یہ کوئی ایسی خبر نہیں جو واقعے کے بعد لکھی گئی ہو، بلکہ وہ اس سے عشروں پہلے زبان زد تھی، یہاں تک کہ اس کے وقوع نے ایک لشکر میں حقیقی بحران پیدا کر دیا۔ اور اگر حدیث صفین کے بعد گھڑی گئی ہوتی تو جس فریق کو یہ مجرم ٹھہراتی ہے وہ اسے کبھی قبول نہ کرتا۔ اور نبی ﷺ نے **ایک متعین شخص** کا نام لیا، اور **اس کی موت کا طریقہ** (قتل، نہ کہ بیماری)، اور **اس کے قاتلوں کا وصف** (باغی گروہ، یعنی ظالم مسلمان، نہ کہ کافر)۔ تین قیدیوں ایک ساتھ واقع ہوئیں۔

میرا یہ بیٹا سردار ہے... اللہ اس کے ذریعے دو گروہوں میں صلح کرائے گا

بے شک میرا یہ بیٹا سردار ہے، اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرا دے

بخاری نے روایت کیا - صحیح

کہا گیا جب حسن ننھے بچے تھے

نہ دو گروہ، نہ لڑائی
اور پوری امت ایک تھی
اور بچہ ابھی بالغ نہ تھا
اور کوئی عہدہ نہیں

سنہ 41 ہجری - سال اتحاد

امت دو لشکروں میں بٹ گئی
حسن صلح کے لیے دستبردار ہوئے
پس مسلمان متحد ہو گئے
اور نام پڑا: عام الجماعة

قدرت رکھتے ہوئے خلافت چھوڑ دی - اور خون بہنے سے بچایا

ابتدائی اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی صلح، اور اس کے کرنے والے کا نام بلوغت سے پہلے ہی لے لیا گیا

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے اپنے نواسے حسن کو اٹھایا، وہ ابھی چھوٹے بچے تھے، اور فرمایا: **اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا۔** اور تقریباً چالیس سال بعد انہوں نے بالکل وہی کیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

امت میں سرے سے دو گروہ تھے ہی نہیں - وہ اپنے نبی کے پیچھے ایک ہی جماعت تھی۔ اور جس بچے کے بارے میں یہ بات کہی گئی وہ ابھی بالغ بھی نہ ہوا تھا، اور معلوم نہ تھا کہ وہ کیا بنے گا۔ اور حدیث ایک ساتھ تین نامعلوم چیزوں کی خبر دیتی ہے: یہ کہ امت **تقسیم ہوگی**، یہ کہ **تقسیم صلح پر ختم ہوگی**، اور یہ کہ یہی متعین بچہ وہ ہے جو اسے طے کرائے گا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

40ھ میں، علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، حسن سے خلافت کی بیعت کی گئی، اور وہ ایک بڑے لشکر کے سربراہ تھے۔ پھر انہوں نے **41ھ میں مسلمانوں کا خون بچانے کے لیے یہ منصب معاویہ کے حوالے کر دیا**، اور برسوں کی باہمی جنگ کے بعد امت ایک آدمی پر جمع ہو گئی۔ اور اس سال کا نام پوری اسلامی تاریخ میں یہ رکھا گیا: **«عام الجماعة»**، یعنی اتحاد کا سال۔ اور حدیث صحیح بخاری میں ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ذرا غور کیجیے کہ یہ ایک جملہ کیا کچھ چاہتا ہے: ایسی امت میں **ایک آنے والے فتنے** کا اثبات جو ابھی بٹی ہی نہیں، اور **اس آدمی کی تعیین جو اسے ختم کرے گا** جبکہ وہ ابھی بولنے والا بچہ بھی نہیں، اور **طریقے کی تعیین** - صلح، نہ کہ جنگ میں فتح۔ اور آخری بات سب سے عجیب ہے: جس کے پاس لشکر بھی ہو اور جواز بھی، اس کے لیے فطری راستہ لڑنا ہے۔ نبی ﷺ کے نواسے کے بارے میں یہ کہا جانا کہ وہ قدرت رکھتے ہوئے دستبردار ہو جائیں گے - اور انہی کے بعض پیروکاروں نے یہی بات ان پر عیب کے طور پر رکھی - پھر اسے «سیادت» اور «اصلاح» کا نام دیا جانا، ایسا حکم ہے جو ہر سیاسی توقع کے خلاف ہے۔ اور یہ حرف بہ حرف واقع ہوا۔

خلافت تیس سال... پھر بادشاہت

میری امت میں خلافت تیس سال ہے، پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی

ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا - البانی نے صحیح قرار دیا



ٹھیک تیس سال میں پانچ خلفاء... پھر نظام حکومت بدل گیا

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے فرمایا کہ منہاج نبوت پر خلافت صرف **تیس سال** رہے گی، پھر حکومت ایسی بادشاہت میں بدل جائے گی جو وراثت میں ملے۔ اور حساب بالکل ٹھیک نکلا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

زمین بھر میں نظام حکومت وراثتی بادشاہت ہی تھا: فارس، روم، حبشہ اور یمن۔ اور افق پر کوئی دوسرا نظام نہ تھا۔ اور جو نظام ابھی شروع بھی نہ ہوا ہو، اس کی **عمر برسوں** میں مقرر کر دینا، پھر یہ کہنا کہ وہ کسی اور چیز کی طرف پلٹ جائے گا، ایک خطرناک تعین ہے جو گنتی اور حساب کو قبول کرتی ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

خلافت نبی ﷺ کی وفات سے 11 ہ میں شروع ہوئی: ابو بکر دو سال تین ماہ، پھر عمر ساڑھے دس سال، پھر عثمان تقریباً بارہ سال، پھر علی تقریباً پانچ سال، پھر حسن تقریباً چھ ماہ، یہاں تک کہ انہوں نے 41 ہ میں دستبرداری اختیار کی۔ **مجموعہ: ٹھیک تیس سال**۔ پھر حکومت بنو امیہ اور پھر بنو عباس میں وراثت میں چلنے والی بادشاہت بن گئی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ ایک ایسا عدد ہے جو **ناپا جا سکتا ہے اور جھٹلایا جا سکتا ہے**، کوئی عام وصف نہیں جو تاویل کا احتمال رکھتا ہو۔ اگر مدت دو سال بڑھ جاتی یا گھٹ جاتی تو بات کھل جاتی۔ اور اس سے بھی عجیب یہ ہے کہ حدیث نے یہ نہیں کہا کہ »پھر اسلام ختم ہو جائے گا« اور نہ یہ کہ »پھر کفر غالب آئے گا« - بلکہ کہا »پھر بادشاہت«، یعنی ریاست کے باقی رہتے ہوئے حکومت کی شکل میں تبدیلی۔ اور بالکل یہی ہوا: اسلامی ریاست باقی رہی اور پھیلی، لیکن حاکم کو چننے کا طریقہ بدل گیا۔ سیاسی توصیف میں ایسی باریک بینی جو عدد کی باریک بینی سے کم نہیں۔

چرواہوں کا اونچی عمارتوں میں مقابلہ

یہ کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے، اور یہ کہ آپ ننگے پاؤں، ننگے بدن، محتاج بکری چرانے والوں کو عمارتوں کی بلندی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے دیکھیں۔

بخاری اور مسلم کی روایت – حدیث جبریل



آج دنیا کی سب سے اونچی عمارت اُس صحرا میں کھڑی ہے جہاں گھر بالوں اور مٹی کے تھے

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے خبر دی کہ آخری زمانے کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ **ننگے پاؤں غریب چرواہے** اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ اور یہی آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس وقت جزیرہ نمائے عرب زمین کے آباد خطوں میں سب سے غریب تھا: نہ کوئی دریا، نہ کھیتی، نہ کوئی معلوم معدن۔ اس کے باشندے چرواہے تھے جو چارے کے پیچھے نقل مکانی کرتے تھے، اور اُن کے گھر بالوں اور مٹی کے تھے، ایک منزل سے اوپر نہیں۔ کسی کے وہم میں بھی نہ تھا کہ یہ سرزمین کبھی دولت اور تعمیر کا مرکز بنے گی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جزیرہ نما میں تیل 1930 کی دہائی میں دریافت ہوا، اور دو نسلوں میں اس کا حال بدل گیا۔ آج دبئی میں **برج خلیفہ** 828 میٹر بلند دنیا کی سب سے اونچی عمارت ہے، زیر تعمیر **برج جدہ** ایک کلومیٹر سے تجاوز کر رہا ہے، اور مکہ میں **ابراج البیت** روئے زمین کی سب سے بڑی عمارتوں میں سے ہے۔ اور «سب سے اونچے» کا مقابلہ اسی خطے کی اعلان شدہ پہچان بن چکا ہے۔

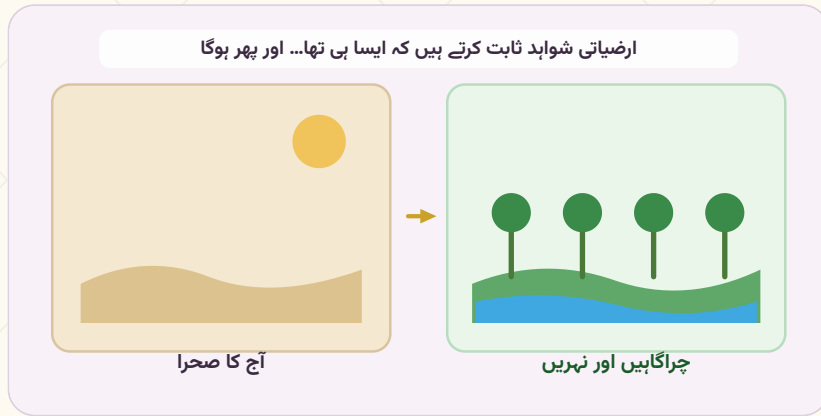
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایک ہی جملے میں تین قیود اسے عام حکمت نہیں بلکہ پیش گوئی بنا دیتی ہیں۔ پہلی: **کرنے والوں کی شناخت** کا تعین – «ننگے پاؤں، ننگے بدن، محتاج بکری چرانے والے»، یعنی بنانے والے **خود وہی غریب** ہیں، کوئی مالدار اور تعمیر میں پرانی قوم نہیں۔ دوسری: فعل «**یتناولون**» – یہ باپ تفاعل ہے اور خاص طور پر **بلندی میں مقابلہ** کو ظاہر کرتا ہے، محض اونچی عمارت بنانے کو نہیں۔ تیسری: یہ بات **ایک عظیم تبدیلی کی نشانی** کے طور پر کہی گئی، یعنی یہ معمول سے ہٹ کر ایسی چیز ہے جو نشانی شمار ہونے کے لائق ہے۔ اور جو شخص ایک ہنجر صحرا کو دیکھ کر خبر دے کہ اس کے باشندے کسی دن زمین کی بلند ترین عمارت پر مقابلہ کریں گے، وہ اندازے سے بات نہیں کر رہا۔

یہاں تک کہ عرب کی سرزمین چراگاہوں اور نہروں کی طرف لوٹ جائے

قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ مال بڑھ جائے اور اُبل پڑے، یہاں تک کہ عرب کی سرزمین چراگاہوں اور نہروں کی طرف لوٹ جائے۔

مسلم کی روایت — صحیح



جزیرہ نما کی ریت کے نیچے قدیم دریاؤں کے راستے ہیں جنہیں سیٹلائٹ نے ظاہر کیا

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عرب کی سرزمین سرسبز چراگاہوں اور بہتی نہروں کی طرف **لوٹے گی**۔ اور کلیدی لفظ یہی «لوٹے گی» ہے — یعنی وہ پہلے ایسی ہو چکی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرہ نمائے عرب لکھی ہوئی تاریخ سے بھی پہلے سے بنجر صحرا رہا ہے، اور اس کے باشندے اس کی کوئی دوسری حالت جانتے ہی نہ تھے۔ اور اس کے دور دراز موسمی ماضی کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور یہ کہنا کہ وہ چراگاہوں کی طرف لوٹے گی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ پہلے چراگاہیں تھی — اور خبر یہیں ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سیٹلائٹ اور زمین میں اترنے والے ریڈار نے جزیرہ نما کی ریت کے نیچے **قدیم دریاؤں کے راستوں کا ایک وسیع جال** ظاہر کیا ہے، جنہیں «پتھرائے ہوئے دریا» کہا جاتا ہے، اور ان میں سب سے بڑے وادی الباطن اور وادی الرمه ہیں۔ اور قدیم موسمیات کے مطالعات نے ثابت کیا ہے کہ جزیرہ نما پر بار بار مرطوب ادوار گزرے ہیں (آخری تقریباً 6 ہزار سال پہلے) جن میں جھیلیں، دریا، چراگاہیں اور بڑے جانور تھے۔ اور وہاں خشک جھیلوں کے کنارے دریائی گھوڑوں اور مگرمچھوں کی ہڈیاں اور پتھر کے اوزار ملے ہیں۔ اور موسمی چکر مستقبل میں نمی کے لوٹنے کی خبر دیتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایک ہی لفظ اعجاز اٹھائے ہوئے ہے: «لوٹے گی»۔ یہ بیک وقت دو باتیں ثابت کرتا ہے: ایک ایسے ارضیاتی ماضی کی خبر جس کا کسی کو علم نہ تھا، اور ایک ایسے **مستقبل** کی پیش گوئی جو ابھی واقع نہیں ہوا۔ اگر «بن جائے گی» کہا جاتا تو یہ صرف مستقبل کی بات ہوتی۔ اور خود حدیث کے اندر کا قرینہ دیکھیے: اس نے اسے «مال بڑھ جائے اور اُبل پڑے» کے ساتھ ملایا — اور یہ حصہ تیل کے ذریعے واقعاً پورا ہو چکا ہے، اور یہی آج وہاں شجرکاری اور زراعت کے بڑے منصوبوں کو مالی سہارا دے رہا ہے۔

ایک آگ جو سرزمینِ حجاز سے نکلے گی

قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ حجاز کی سرزمین سے ایک آگ نکلے جو بُصریٰ میں اونٹوں کی گردنیں روشن کر دے۔

بخاری اور مسلم کی روایت — متفق علیہ



ایک تاریخی آتش فشانی دھماکا جو مصادر میں اور لاوے کی تہوں میں درج ہے

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے خبر دی کہ ایک آگ سرزمینِ حجاز سے نکلے گی جس کی روشنی شام کے شہر بُصریٰ تک پہنچے گی، جو سیکڑوں کلومیٹر دور ہے۔ اور یہ 1256 عیسوی میں واقع ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

حجاز ایک صحرائی سرزمین ہے جس کے باشندوں نے اپنی زندگی میں کوئی آتش فشاں نہیں دیکھا تھا۔ اور «آتش فشاں» کا لفظ ہی اُن کے ماحول میں معلوم نہ تھا۔ اور نکلنے کی جگہ اور روشنی کی پہنچ کو کسی دوسرے ملک کے ایک معین شہر کے نام سے متعین کرنا ایسی تفصیل ہے جو یقین کے بغیر نہیں کہی جاتی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جمادی الآخرہ 654 ہجری / جون 1256 عیسوی میں مدینہ منورہ کے مشرق میں حزہ ربط میں ایک آتش فشاں پھٹا، جو 52 دن جاری رہا، اور اس سے 23 کلومیٹر لمبا لاوے کا دریا بہا۔ اس کے ہم عصر مؤرخین — ابو شامہ، قرطبی اور نووی — نے اس کا بیان کیا، اور ابن کثیر نے ان کی خبریں «البدایہ والنہایہ» میں نقل کیں، اور انہوں نے لکھا کہ اس کی روشنی بُصریٰ، تیماء اور مکہ سے دیکھی گئی، اور لوگ رات کو اس سے روشنی لیتے تھے۔ اور ماہرینِ ارضیات نے حزہ ربط کے لاوے کے بہاؤ کا مطالعہ کر کے انہیں اسی تاریخ سے منسوب کیا ہے۔

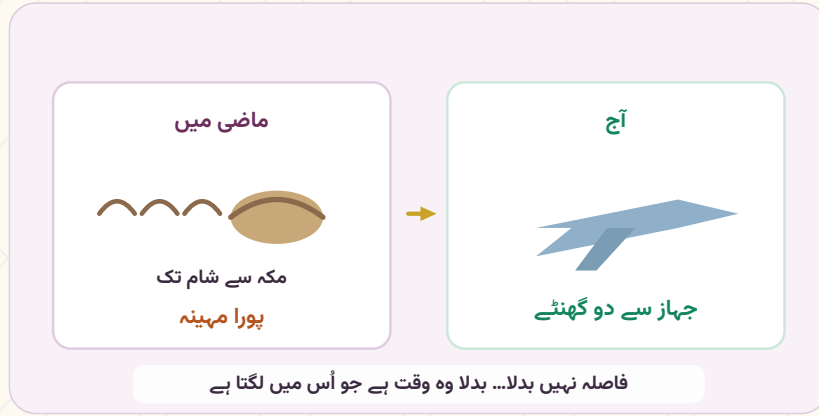
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

وصف کی باریکی دیکھیے: صرف «ایک بڑی آگ» نہیں کہا، بلکہ نظر آنے والا اثر متعین کیا: «بُصریٰ میں اونٹوں کی گردنیں روشن کر دے»۔ اور بُصریٰ جنوبی شام کا ایک شہر ہے، جو مدینہ سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر دور ہے۔ اور خاص طور پر «اونٹوں کی گردنوں» کی تفصیل عجیب لگتی ہے جب تک سمجھ میں نہ آئے: دور کی افقی چمک افق کی لکیر سے اوپر اٹھی ہوئی چیزوں کو روشن کرتی ہے، اور اونٹ کی گردن قافلے میں سب سے اونچی چیز ہے۔ اور بالکل یہی وہ ہے جو مؤرخین نے چھ صدیوں بعد بیان کیا۔ اور یہ واقعہ بہت سے مستقل مصادر میں درج ہے اور پتھر میں ارضیاتی طور پر ثابت ہے۔

زمانہ قریب ہوتا جائے گا

قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ زمانہ قریب ہو جائے، تو سال مہینے جیسا ہو جائے، اور مہینہ ہفتے جیسا، اور ہفتہ دن جیسا۔

احمد اور ترمذی کی روایت – البانی نے صحیح کہا



جو کام ایک مہینہ لیتا تھا اب دو گھنٹے لیتا ہے

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ زمانہ **قریب ہوتا جائے گا**، تو سال مہینے جیسا اور مہینہ ہفتے جیسا ہو جائے گا۔ اور یہی ہم جی رہے ہیں: جو کام مہینے مانگتا تھا اب دو گھنٹے مانگتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تخلیق کی ابتدا سے انسان کے تجربے میں وقت ایک ثابت چیز تھا۔ اونٹ اور گھوڑے کا سفر، خط مہینوں چلنا، اور خبر موسموں کے بعد پہنچتی۔ اور تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ نسبتیں کبھی بدلیں گی – یہ تو زندگی کے ثوابت میں سے تھیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جو فاصلہ قافلہ ایک مہینے میں طے کرتا تھا، ہوائی جہاز دو گھنٹے میں طے کر لیتا ہے۔ اور جو خط مہینوں لیتا تھا، اب ایک سیکنڈ سے بھی کم میں پہنچ جاتا ہے۔ اور جو کام کتب خانوں میں ایک عمر کی تلاش مانگتا تھا، منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ اور یہ تیزی عمرانیات میں **«زمان و مکان کے دباؤ»** (Time-Space Compression) کے نام سے مطالعے کا موضوع بن چکی ہے، اور یہ ایک مسلّمہ اصطلاح ہے جو نقل و حمل اور رابطے کی رفتار کے اثر کو فاصلوں کے ادراک پر بیان کرتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

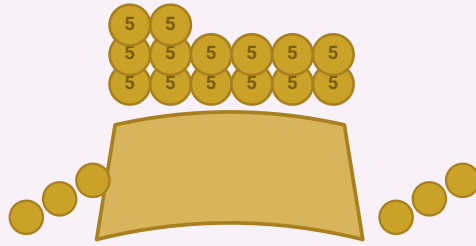
خود یہ تعبیر ہی اعجاز ہے۔ نہ یہ کہا کہ «برکت کم ہو جائے گی» اور نہ یہ کہ «عمر تیزی سے گزرے گی» – حالانکہ دونوں ممکن اور قابل قبول تفسیریں ہیں۔ بلکہ **ایک درجہ بہ درجہ ریاضیاتی نسبت** کا سیغہ استعمال کیا: سال – مہینہ، مہینہ – ہفتہ، ہفتہ – دن، اور دن – گھنٹہ۔ یعنی زمانی اکائی ہر درجے پر سکڑ کر اپنے تقریباً دسویں حصے پر آ جاتی ہے۔ اور **«یتقارب»** باپ مفاعله کا فعل ہے جو دونوں کناروں کے ایک دوسرے کے قریب آنے کو ظاہر کرتا ہے – اور یہ فاصلوں کے سکڑنے کا باریک وصف ہے، صرف برکت کی کمی کا نہیں۔ اور «زمان و مکان کا دباؤ» کی اصطلاح، جو ماہر جغرافیہ ڈیوڈ ہاروی نے بیسویں صدی میں گھڑی، تقریباً اسی عبارت کا لفظی ترجمہ ہے۔

مال اتنا بڑھے گا کہ صدقہ لینے والا نہ ملے گا

قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ آپ میں مال بڑھ جائے اور اُبل پڑے، یہاں تک کہ مال والے کو یہ فکر لاحق ہو کہ اس کا صدقہ کون قبول کرے گا۔

بخاری اور مسلم کی روایت — متفق علیہ

وہ امت جو بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھتی تھی



فراوانی کے مسائل... نہ کہ قلت کے مسائل

نبی کریم ﷺ کے پیٹ پر پتھر باندھنے سے... ایک ایسے فاضل مال تک جس کا لینے والا نہیں

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا جس میں مال اتنا بڑھ جائے گا کہ مال والا ایسا محتاج ڈھونڈنے میں تھک جائے گا جو اس کا صدقہ قبول کرے۔ اور یہ تاریخ میں کئی بار ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ بات ایک ایسے معاشرے میں کہی گئی جو واقعی بھوک جھیل رہا تھا: صحابہ غزوہ خندق کے دن اپنے پیٹوں پر پتھر باندھتے تھے، اور اہل صفہ کو ستر ڈھانپنے کو کپڑا نہ ملتا تھا۔ اور یہ خیال کہ مال اتنا اُبل پڑے کہ کوئی محتاج ہی نہ ملے، اُس دن ناقابل تصور تھا۔ اور اُس وقت تک کی ساری انسانی تاریخ قلت کی تاریخ تھی، فراوانی کی نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ کھلے طور پر عمر بن عبدالعزیز کی خلافت میں ہوا، یہاں تک کہ مؤرخین نے لکھا کہ ان کے عامل مال لے کر پھرتے تھے اور کوئی لینے والا نہ ملتا تھا، تو انہوں نے اس سے غلام آزاد کرائے اور بے نکاح لوگوں کے نکاح کرائے۔ اور ہمارے زمانے میں: خلیجی ممالک جن میں مال اتنا اُبل رہا ہے کہ اب مشکل زکات کے مصارف تلاش کرنا ہے، عالمی خیراتی ادارے جو ایسے فاضل مال کا اعلان کرتے ہیں جس کا مصرف اپنے ملک میں نہیں ملتا، اور نئے معاشی مسائل جن کے نام «زائد پیداوار» اور «حد سے زیادہ صرف» ہیں۔

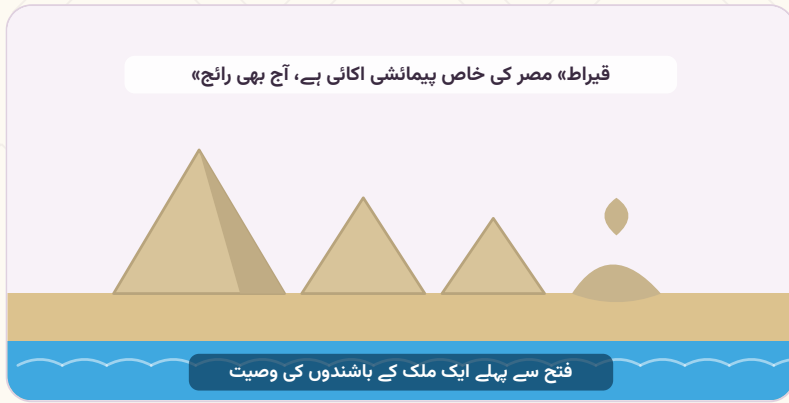
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں پیش گوئی یہ نہیں کہ «لوگ مالدار ہو جائیں گے» — یہ تو ممکن بات ہے — بلکہ یہ بالکل الٹی ہوئی ایک مساوات ہے: کہ لینے کے بجائے دینا مسئلہ بن جائے۔ اور یہ معاشرے کی ساخت میں ایک انقلاب ہے، محض حالت کی بہتری نہیں۔ اور فعل «بُهِم» باریک ہے: یعنی اسے بے چین کرے اور اس کا دھیان گھیرے — تو مسئلہ نفسیاتی اور انتظامی ہے، مادی نہیں۔ اور یہی بالکل آج کے زکات فنڈز کا حال ہے جب وہ ایسے فاضل مال کا اعلان کرتے ہیں جس کا کوئی مصرف نہیں۔ اور یہ اُن لوگوں سے کہا گیا جنہیں دن بھر کا کھانا میسر نہ تھا۔

آپ مصر فتح کریں گے... اس کے لوگوں سے بھلائی کریں

آپ لوگ مصر فتح کریں گے، اور وہ ایسی سرزمین ہے جس میں قیراط کا نام لیا جاتا ہے۔ تو جب اسے فتح کر لیں تو اس کے اہل سے بھلائی کریں، کیونکہ اُن کا ایک ذمہ ہے اور ایک رشتہ۔

مسلم کی روایت - صحیح



مصر: نبی کریم ﷺ نے اس کی فتح سے تقریباً دس سال پہلے اس کے بارے میں وصیت کی

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان **مصر فتح کریں گے**، اور اس میں داخل ہونے سے پہلے ہی انہیں اس کے باشندوں سے بھلائی کی وصیت کی۔ اور اس کی ایک نشانی بتائی: کہ وہ ایسی سرزمین ہے جس میں **«قیراط»** استعمال ہوتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس وقت مصر رومیوں کی ایک مضبوط ولایت تھا، اور اسلامی ریاست نوزائیدہ تھی جو ابھی جزیرہ نما سے باہر بھی نہ نکلی تھی۔ اور عرب مصر کو تجارت کے راستے جانتے تھے، اس کے نظاموں کی تفصیلات نہیں جانتے تھے۔ اور کسی ملک کے باشندوں کے بارے میں **اس کی فتح سے پہلے** وصیت کرنا اس بات کا جزم ہے کہ وہ فتح ہوگا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مصر 20 ہجری میں عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں عمرو بن العاص کے ہاتھوں فتح ہوا۔ ربا «قیراط»، تو یہ یونانی مصری اصل کی ماپ کی ایک اکائی ہے، اور آج تک مصر میں زمین ناپنے کے لیے (قیراط = فدان کا 1/24) اور سونے کے لیے (21 اور 24 قیراط عیار) استعمال ہوتی ہے۔ اور یہ ایسی اکائی ہے جو **عرب کے دوسرے ملکوں میں اس عام طور پر استعمال نہیں ہوتی**۔ اور مؤرخین برابر لکھتے رہے کہ اہل مصر اس نام کے ساتھ خاص ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ذکر کی گئی نشانی ہی گواہ ہے: «ایسی سرزمین جس میں قیراط کا نام لیا جاتا ہے»۔ اور یہ ایک ایسی مقامی اصطلاح سے پہچان کرانا ہے جو اُس ملک کے باشندوں کے ساتھ خاص تھی جس میں مسلمان ابھی داخل بھی نہ ہوئے تھے - اور یہ اُس قسم کی تفصیل ہے جو جاننے والے کے سوا کوئی نہیں بتاتا۔ پھر اس سے بھی عجیب علت: «کیونکہ اُن کا ایک ذمہ ہے اور ایک رشتہ» - اور رشتے سے اشارہ باجرہ کی طرف ہے، جو اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اور مصری تھیں، اور ماریہ قبطیہ کی طرف، جو نبی کریم ﷺ کے بیٹے ابراہیم کی والدہ تھیں۔ تو یہ وصیت ایک حقیقی نسب پر قائم ہے۔ ایک قوم کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت، اُن کے ملک کی فتح سے تقریباً دس سال پہلے، ایک ایسے شخص کی طرف سے جس کے پاس یہ بات کہتے دن کوئی لشکر ہی نہ تھا۔

اویس قرنی... ایک ایسے شخص کا وصف جسے دیکھا نہ تھا

آپ لوگوں کے پاس اویس بن عامر یمن والوں کی کمک کے ساتھ آئے گا، مراد سے، پھر قرن سے۔ اسے برص تھا، پھر وہ اس سے شفا پا گیا سوائے ایک درہم کی جگہ کے۔ اس کی ایک والدہ ہے جس کے ساتھ وہ نیک سلوک کرتا ہے۔ ❖

مسلم کی روایت - صحیح

پانچ نشانیاں، پہلے سے متعین

- ✓ نام: اویس بن عامر
- ✓ اُس کا قبیلہ: مراد، پھر قَرن
- ✓ برص تھا، پھر شفا پا گیا
- ✓ ایک درہم کی جگہ باقی رہی
- ✓ ماں سے نیک سلوک، اور بس

عمر نے برسوں بعد اسے انہی سب نشانیوں سے پایا

عمر بن الخطاب حج کے موسموں میں اس کے بارے میں پوچھتے رہے یہاں تک کہ اسے پا لیا

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے شخص کا وصف بیان کیا جسے نہ کبھی دیکھا تھا نہ ملے تھے: اس کا نام، اس کا قبیلہ، یہ کہ وہ ایک بیماری سے شفا پا چکا ہے سوائے ایک سکے جتنے دھبے کے، اور یہ کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اسے انہی سب نشانیوں کے ساتھ پایا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اویس یمن کا ایک گمنام شخص تھا، نہ جاہ نہ شہرت، اور وہ نبی کریم ﷺ سے کبھی نہ ملا (اسی لیے وہ صحابہ میں نہیں بلکہ تابعین میں شمار ہوتا ہے)۔ اور یمن اور مدینہ کے درمیان لمبا فاصلہ ہے، اور وہاں کے عام افراد کی خبریں جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور وصف میں ایک نہایت باریک جسمانی نشانی بھی شامل ہے جسے اُسی نے جانا ہوگا جس نے اسے برہنہ دیکھا ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سال بہ سال یمن والوں کی کمک میں اویس کے بارے میں پوچھتے نکلتے رہے، یہاں تک کہ اُن سے جا ملے۔ پھر اُن سے اُن کا نام اور قبیلہ پوچھا، پھر برص کے بارے میں پوچھا تو معاملہ ویسا ہی پایا جیسا بیان ہوا تھا، پھر پوچھا: «کیا آپ کی والدہ ہیں؟» کہا: جی ہاں۔ تو اُن سے درخواست کی کہ وہ اُن کے لیے مغفرت مانگیں۔ اور پورا قصہ صحیح مسلم میں ہے، جو اس باب کی سب سے معتبر روایات میں سے ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

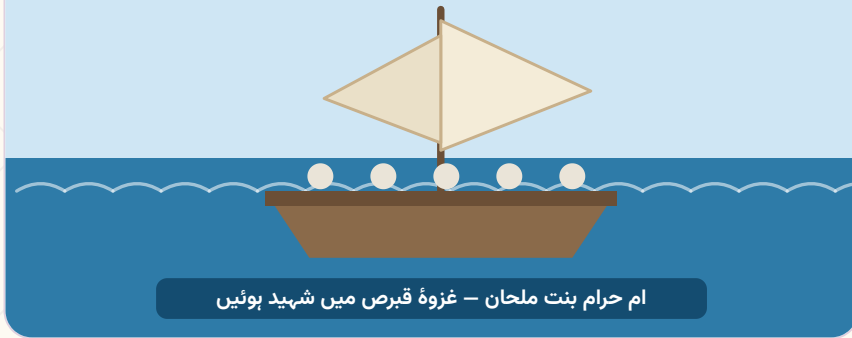
پانچ مستقل نشانیاں ایک ہی شخص میں جمع ہوئیں۔ نام اور نسب تو شاید کوئی اٹکل لگانے والا بھی پا لے، لیکن چوتھی نشانی فیصلہ کن ہے: «اسے برص تھا جس سے وہ شفا پا گیا سوائے ایک درہم کی جگہ کے» - یہ ایک گزری ہوئی بیماری کا، اس سے شفا کا، اور ایک متعین ناپ کے بچے ہوئے نشان کا وصف ہے۔ ایک ہی نشانی میں تین معلومات، دوسرے ملک میں رہنے والے ایک شخص کے جسم کے بارے میں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اُن سے دعا کی درخواست کریں - تو امیر المؤمنین برسوں ایک گمنام چرواہے کو تلاش کرتے رہے تاکہ وہ اُن کے لیے مغفرت مانگے۔ اور اگر ایک نشانی بھی غلط نکلتی تو ساری خبر صحابہ کی آنکھوں کے سامنے گر جاتی۔

پہلا لشکر جو سمندر میں اترے گا

میری امت کا پہلا لشکر جو سمندر میں جہاد کرے گا، اُس نے جنت واجب کر لی... پھر فرمایا:
آپ اولین لوگوں میں سے ہیں۔

بخاری اور مسلم کی روایت — متفق علیہ

کہا گیا جب مسلمانوں کے پاس ایک جہاز بھی نہ تھا



ام حرام بنت ملحان — غزوہ قبرص میں شہید ہوئیں

اسلام کی پہلی بحری مہم — قبرص، 28 ہجری

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے خواب میں اپنی امت کا ایک لشکر **سمندر میں اترتے** دیکھا، تو ام حرام نے درخواست کی کہ وہ دعا کریں کہ وہ بھی اُن میں ہوں، تو فرمایا: **«آپ اولین میں سے ہیں»**۔ اور ایسا ہی ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عرب خشکی کی قوم تھے، سمندر کی نہیں۔ نہ اُن کے پاس جہاز تھے نہ بحری جنگ کا علم، اور اُن کی ثقافت میں سمندر ایک ڈراؤنی چیز تھا جس سے بچا جاتا تھا۔ بلکہ عمر بن الخطاب نے اپنی پوری خلافت میں لوگوں پر خوف کے سبب سمندری جہاد کی اجازت دینے سے انکار کیا۔ تو ایک اسلامی بحری لشکر کی پیش گوئی بے حد بعید تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

28 ہجری میں عثمان بن عفان نے معاویہ کو سمندری جہاد کی اجازت دی، تو پہلا اسلامی بحری بیڑا بنا اور اس نے **قبرص** پر حملہ کیا۔ اور اس کے ساتھ **ام حرام بنت ملحان** رضی اللہ عنہا بھی نکلیں، پھر جب وہ اتریں تو اُن کے لیے سواری لائی گئی جس نے انہیں گرا دیا اور وہ وفات پا گئیں، تو وہیں دفن ہوئیں۔ اور اُن کی قبر آج تک قبرص میں «ہالا سلطان تکیہ» کے نام سے معروف ہے اور لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں۔ اور قصہ صحیحین میں ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایک مختصر جملے میں خبر کی تین تہیں۔ پہلی: کہ امت کا سرے سے **ایک بحری لشکر** ہوگا — حالانکہ یہ صحرا کی قوم ہے جس کے پاس جہاز ہی نہیں۔ دوسری: کہ ایک معین خاتون **اُس میں ہوں گی** — اور وہ اُس دن مدینہ میں تھیں، سمندر کا خیال تک نہ تھا۔ تیسری، اور یہی سب سے باریک ہے: کہ وہ «**اولین**» میں سے ہوں گی، آخرین میں سے نہیں — یعنی خاص طور پر **پہلی مہم** میں، کسی بعد کی مہم میں نہیں۔ اور انہوں نے تو درخواست کی تھی کہ وہ اُس دوسری جماعت میں ہوں جو انہوں نے دیکھی تھی، تو فرمایا: «آپ اولین میں سے ہیں»۔ سو تعین اپنی جگہ پوری ہوئی۔ اور وہ اسی مہم میں وفات پا گئیں، خبر کے تقریباً بیس سال بعد۔

خوارج... اور وہ شخص جس کا ایک ہاتھ عورت کی چھاتی جیسا تھا

آپ لوگوں میں ایک ایسی قوم نکلے گی جس کی نماز کے سامنے آپ اپنی نماز کو حقیر سمجھیں گے... وہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ اُن کے حلق سے نیچے نہ اترے گا؛ وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے پار نکل جاتا ہے۔

بخاری اور مسلم کی روایت – متفق علیہ

اس فرقے کا وصف جو ابھی نکلا نہ تھا... اور اس کے ایک آدمی کی نشانی

تیر شکار سے پار نکلتا ہے اور اُس کا کچھ ساتھ نہیں لگتا



فیصلہ کن نشانی: اُن میں ایک شخص جس کا ایک ہاتھ
عورت کی چھاتی جیسا، لرزتا ہوا – اور جنگ کے بعد ملا

علی رضی اللہ عنہ نے مقتولوں میں اسے تلاش کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ وہ مل گیا

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے ایک ایسی جماعت کا وصف بیان کیا جو مسلمانوں میں نکلے گی: ظاہر میں اُن کی عبادت بہت سخت ہوگی اور وہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ دین سے نکل جائیں گے۔ اور ایک نشانی دی: اُن میں ایک شخص ہوگا جس کا ہاتھ ادھورا اور عجیب شکل کا ہوگا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس وقت امت میں نہ کوئی فرقہ تھے نہ کوئی تقسیم۔ اور ایسے لوگوں کا خیال جو شدتِ عبادت اور دین سے نکل جانے کو جمع کر لیں بظاہر متضاد تھا – کیونکہ معمول یہ ہے کہ بھٹکا ہوا شخص اپنی عبادت میں کوتاہ ہوتا ہے، اس میں مبالغہ کرنے والا نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

خوارج علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ظاہر ہوئے، انہوں نے مسلمانوں کو کافر کہا اور اُن کے خون حلال ٹھہرائے، جبکہ وہ لمبی نماز اور کثرتِ تلاوت میں مشہور تھے۔ اور علی رضی اللہ عنہ نے 38 ہجری میں **نہروان** میں اُن سے جنگ کی۔ اور جنگ کے بعد اُس بیان کیے گئے شخص کو تلاش کرنے کا حکم دیا، تو اسے مقتولوں میں ڈھونڈا گیا یہاں تک کہ وہ مل گیا: ایک شخص جس کا ایک ہاتھ عورت کی چھاتی جیسا تھا، تو علی رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہی اور فرمایا: «اللہ نے سچ کہا اور اس کے رسول نے پہنچا دیا»۔ اور قصہ صحیح مسلم میں ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تشبیہ خود نہایت باریک ہے: «وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے پار نکل جاتا ہے»۔ اور تیر جب شکار کے پار نکلتا ہے تو صاف نکلتا ہے، اس پر خون یا گوشت کچھ نہیں لگتا – اور یہ اُس کا وصف ہے جو دین سے گزر جائے اور اس کے پاس اس میں سے کچھ باقی نہ رہے، باوجود اس کے کہ وہ اس میں بہت تیز ہو۔ لیکن فیصلہ کن چیز **جسمانی نشانی** ہے: ایک معین شخص کے بازو میں ایک نادر بگاڑ، ایک ایسی جماعت میں جو ابھی پیدا ہی نہ ہوئی تھی، ایک ایسی جنگ میں جو ابھی ہوئی ہی نہ تھی۔ اور یہ ایسی نشانی ہے جسے فوراً **جانچا جا سکتا ہے** – اسی لیے علی رضی اللہ عنہ نے خود مقتولوں میں اسے تلاش کیا۔ اور اگر وہ نہ ملتا تو خبر ایک پورے لشکر کے سامنے گر جاتی۔

چھوٹی آنکھوں اور چوڑے چہروں والی ایک قوم

قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ آپ ایک ایسی قوم سے جنگ کریں جن کے جوتے بالوں کے ہوں گے، اور یہاں تک کہ آپ ترکوں سے جنگ کریں — چھوٹی آنکھوں والے، سرخ چہروں والے، چپٹی ناکوں والے، گویا اُن کے چہرے تہ دار ڈھالیں ہوں۔

بخاری اور مسلم کی روایت — متفق علیہ

ایسی قوم کا باریک نسلی وصف جسے عرب نے دیکھا نہ تھا



«چھوٹی آنکھیں · چوڑے چہرے · چپٹی ناکیں»

منگول بلغار — ساتویں صدی ہجری

وسطی ایشیا کی قوموں کے نقوش، عربوں کے انہیں دیکھنے سے صدیوں پہلے بیان ہوئے

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے ایک ایسی قوم کا وصف بیان کیا جن سے مسلمان جنگ کریں گے، اور اُن کے چہروں کی ساخت بیان کی: چھوٹی آنکھیں، چوڑے گول چہرے، اور چھوٹی چپٹی ناکیں۔ اور یہ وسطی ایشیا کی قوموں اور منگولوں کے نقوش ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرہ نما کے عرب اپنے سوا صرف رومیوں، فارسیوں اور حبشیوں کو دیکھتے تھے — اور اُن سب کے نقوش اس وصف سے بالکل مختلف ہیں۔ اور ایشیائی میدانوں کی قومیں فارس کے پیچھے دور مشرق میں تھیں، جن کی خبر جزیرہ نما تک نہ پہنچتی تھی۔ اور عربوں اور اُن کے درمیان نہ کوئی رابطہ تھا، نہ جنگ، نہ تجارت۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

حدیث نے تین تشریحی خصوصیات بیان کیں جو آج مشرقی اور وسطی ایشیا کی قوموں کی امتیازی علامتیں مانی جاتی ہیں: تنگ پیوٹوں کا شگاف مع گوشہ چشم کی تہ، چوڑا چپٹا چہرہ جس کی رخساری ہڈیاں ابھری ہوئی ہوں، اور چھوٹی، نیچی ڈنڈی والی ناک۔ اور جنگ واقعاً ہوئی: ساتویں صدی ہجری کا منگول حملہ جس نے 656 ہجری میں بغداد تباہ کیا، پھر 658 ہجری میں عین جالوت میں شکست کھائی۔ اور اس سے پہلے پہلی صدی ہی سے مسلمانوں کی ترکوں کے ساتھ ماوراء النہر میں جنگیں ہوئیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ ایک بشریاتی وصف ہے، نہ سیاسی نہ عسکری۔ اور یہ کسی ایک خصوصیت پر نہیں رکا جو اتفاقاً درست بیٹھ سکتی ہو، بلکہ چار ساتھ پائی جانے والی خصوصیات کو جمع کیا جو مل کر ایک معین چہرے کا نمونہ بناتی ہیں، جسے آج نسلیات کا علم پہچانتا ہے۔ اور آخری تشبیہ نہایت باریک ہے: «گویا اُن کے چہرے تہ دار ڈھالیں ہوں» — اور مَجَنّ ڈھال کو کہتے ہیں، اور مُطَرَقہ وہ ہے جس پر چمڑے کی تہیں چڑھائی گئی ہوں، تو وہ چوڑی، گول اور کم ابھری ہوئی ہو جاتی ہے۔ ایک شخص جزیرہ نما کے صحرا میں بیٹھ کر چین کے پار بسنے والی ایک قوم کے نقوش بیان کرے، پھر خبر دے کہ اس کی امت اُن سے جنگ کرے گی — اس میں اٹکل کا کوئی دخل نہیں۔

وہ شراب پئیں گے اور اسے دوسرے نام سے پکاریں گے

میری امت کے کچھ لوگ ضرور شراب پئیں گے، اسے اس کے نام کے سوا دوسرے نام سے پکاریں گے

ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا – البانی نے صحیح کہا

نام بدلتا ہے... حقیقت ایک ہی ہے



نام بدل کر حرمت سے بچنا – حدیث نے وقوع سے پہلے بیان کیا

نام بدل دیا جاتا ہے تاکہ حرام کا لینا آسان ہو جائے

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ان کی امت کے کچھ لوگ شراب پئیں گے، مگر **اسے شراب نہیں کہیں گے** – وہ اسے دوسرے نام دیں گے تاکہ گوارا بھی ہو جائے اور جواز بھی نکل آئے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

شراب کو کھلے عام اس کے اپنے نام سے پکارا جاتا تھا اور شاعری میں اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ کسی کو اس سے شرم نہ تھی، نہ نام چھپانے کی ضرورت۔ سو حدیث ایک خاص **نفسیاتی اور سماجی** رویے کی خبر دے رہی ہے: لوگ حرمت کو مانیں گے، پھر نام بدل کر اس سے بچ نکلیں گے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ عمرانیات اور لسانیات میں ایک معلوم ظاہر ہے جسے «**تلطیف لفظی**» (Euphemism) کہتے ہیں: کسی چیز کا نام بدل دینا تاکہ اس کی شدت کم ہو جائے یا اس کی ممانعت سے بچا جا سکے۔ ہمارا زمانہ اس کی مثالوں سے بھرا ہے: «روحانی مشروبات»، «صحت بخش نبیذ»، «انرجی ڈرنکس» جن میں الکحل ہوتی ہے، «خمیر شدہ املی»، اور «بغیر الکحل کی بیئر» جس میں کچھ نہ کچھ الکحل ہوتی ہے۔ یہی اصول سود میں برتا جاتا ہے («فائدہ»، «سرمایہ کاری کا منافع») اور دوسرے محرّمات میں بھی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

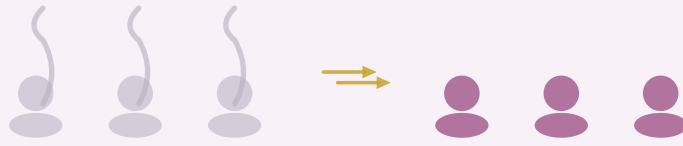
یہاں پیشین گوئی کسی **فعل** کی نہیں بلکہ ایک **لسانی چال** کی ہے – اور یہ کہیں زیادہ باریک اور مشکل بات ہے۔ یہ کہنا کہ «کچھ لوگ شراب پئیں گے» ایک متوقع خبر ہے۔ مگر **حیلے کا طریقہ** متعین کر دینا – یعنی حکم کا انکار نہیں بلکہ نام کی تبدیلی – ایک ایسے نفسیاتی و سماجی طریق کار کا بیان ہے جو اس معاشرے میں سرے سے نظر ہی نہ آتا تھا۔ آج یہ عمرانی لسانیات کا ایک پورا باب ہے۔ اور یہ اس دوسری حدیث کے عین مطابق ہے جس میں اس شخص کی مذمت ہے جو «حرام کو ایک نام دے کر حلال کر لیتا ہے» – قاعدہ ایک ہی ہے، خواہ صورتیں کتنی ہی ہوں۔

تم ضرور اپنے سے پہلوں کے طریقوں پر چلو گے

تم ضرور اپنے سے پہلوں کے طریقوں پر بالشت بہ بالشت اور ہاتھ بہ ہاتھ چلو گے، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسیں تو تم بھی ان کے پیچھے گھسو گے

بخاری اور مسلم نے روایت کیا – متفق علیہ

تہذیبوں کے عروج و زوال کے نمونوں کا تکرار



قومیں اپنے پیش روؤں کی غلطیاں اس حد تک دہراتی ہیں کہ مؤرخ حیران رہ جاتے ہیں

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ امت اپنے سے پہلی قوموں کی **قدم بہ قدم** نقل کرے گی، حتیٰ کہ ان فضول باتوں میں بھی جن میں کوئی فائدہ نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عام تصور یہ تھا کہ ہر قوم کا اپنا الگ راستہ ہے، اور مسلمان اپنے دین کی وجہ سے اس سے بلند ہیں کہ اسی گڑھے میں گریں جس میں اور لوگ گرے۔ کسی ایسے «قانون» کا تصور ہی نہ تھا جو بلا استثنا تمام قوموں کے سفر پر حکم کرتا ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

تاریخی عمرانیات میں اسی کو «**تہذیبی ادوار**» کہتے ہیں۔ ابن خلدون نے سات صدیاں بعد اپنے مقدمے میں اسے مرتب کیا، اور بیسویں صدی میں اوسوالڈ شپینگلر اور آرنلڈ ٹوائن بی نے اسی پر اپنے نظریے کھڑے کیے: **قومیں عروج، عیش اور زوال کے ملتے جلتے مرحلوں سے گزرتی ہیں** اور اپنے پیش روؤں کی غلطیاں ایسے دہراتی ہیں کہ بات تقریباً حتمی لگتی ہے۔ ماہرینِ عمرانیات نے افراد کے رویے میں اسی سے ملتا جلتا ظاہر دیکھا اور اسے «**بھیڑ چال**» (Herd Behaviour) کا نام دیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اصل باریکی آخری قید میں ہے: «اگر وہ گوہ کے بل میں گھسیں تو تم بھی ان کے پیچھے گھسو گے»۔ حدیث نفع بخش چیز کی نقل کی بات نہیں کر رہی — وہ تو معقول اور قابلِ تعریف ہے — بلکہ اس چیز کی نقل کی جس میں نہ فائدہ ہے نہ معنی، بلکہ جس میں کھلا نقصان ہے۔ اور آج ماہرینِ عمرانیات ٹھیک یہی چیز بیان کرتے ہیں: رویوں کے وہ فیشن جو بغیر کسی معقول سبب کے معاشروں پر چھا جاتے ہیں۔ اور آپ قسم و تاکید کے صیغے «**لَتَتَّبِعَنَّ**» پر بھی غور کیجیے — یہ کسی ممکنہ خطرے سے خبردار کرنا نہیں، وقوع کا جزم ہے۔ اور یہ ایسے ہوا کہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

قومیں ایک دوسرے کو بلائیں گی... اور سیلاب کا جھاگ

قریب ہے کہ قومیں تم پر ایک دوسرے کو یوں بلائیں جیسے کھانے والے اپنے دسترخوان پر ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ کہا گیا: کیا اس دن ہم تھوڑے ہوں گے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ اس دن تم بہت ہو گے، لیکن تم سیلاب کے

جھاگ کی طرح جھاگ ہو گے

ابو داؤد اور احمد نے روایت کیا - البانی نے صحیح کہا

آج مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک ارب اسی کروڑ



حدیث نے قلتِ تعداد کو سبب ماننے سے انکار کیا - اور اصل سبب بتا دیا

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قومیں مسلمانوں پر یوں ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے والے دسترخوان پر۔ پوچھا گیا: کیا کمی کے سبب؟ فرمایا: **نہیں، بلکہ تم بہت ہو گے** - مگر بے وزن اور بے اثر۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

امت اس وقت زمین کی سب سے بڑی طاقت بننے کے راستے پر تھی۔ ایک ہی نسل کے بعد اس نے فارس، شام، مصر اور شمالی افریقہ فتح کر لیے۔ چنانچہ **عددی کثرت** کے ساتھ آنے والی کمزوری کی خبر دینا سامنے کے حالات سے بالکل الٹی بات لگتی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

آج مسلمانوں کی تعداد تقریباً **دو ارب** ہے، یعنی پیو ریسرچ سینٹر کے مطابق زمین کی آبادی کا تقریباً **26%**، اور ان کے پاس دنیا کے سب سے بڑے توانائی کے ذخائر اور اہم جغرافیائی مقامات ہیں۔ اس کے باوجود عالمی علمی، صنعتی اور معاشی پیداوار میں ان کا حصہ ان کی تعداد کے مقابلے میں نہایت کم ہے، اور ان کے ملک زمین کے سب سے زیادہ نزاع زدہ اور محتاج خطوں میں ہیں۔ **عددی کثرت موجود ہے، تہذیبی وزن غائب** - یہی وہ مساوات ہے جو حدیث نے بعینہ بیان کی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس حدیث کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے **غلط توجیہ کو پہلے ہی صریح طور پر رد کر دیا**۔ جب پوچھا گیا: «کیا اس دن ہم تھوڑے ہوں گے؟» تو آپ نے ہاں نہیں کہا - فرمایا: «بلکہ اس دن تم بہت ہو گے»۔ یوں تعداد کو پورے حساب سے نکال باہر کیا اور طے کر دیا کہ **خرابی معیار میں ہے، مقدار میں نہیں**۔ اور «**سیلاب کے جھاگ**» کی تشبیہ نہایت باریک ہے: جھاگ وہ کف اور تنکے ہیں جو سیلاب سطح پر بہا لے جاتا ہے؛ دیکھنے میں بہت، وزن کچھ نہیں، کہیں ٹھہرتے نہیں، اور جدھر ہانکے جائیں ادھر بہہ جاتے ہیں، جدھر خود چاہیں ادھر نہیں۔ پھر حدیث کے آخر میں سبب بھی بتا دیا: «وہن... دنیا کی محبت اور موت کی ناپسندیدگی» - یہ نفسیاتی تشخیص ہے، عسکری نہیں۔

»پھر تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟« - پوچھے جانے سے پہلے بتایا گیا سوال

شیطان تم میں سے کسی کے پاس آ کر کہتا ہے: یہ کس نے پیدا کیا؟ وہ کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ کہتا ہے: تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہاں پہنچے تو اللہ کی پناہ مانگے اور رک جائے

بخاری اور مسلم نے روایت کیا - متفق علیہ



شکل، انجام اور علاج - تینوں ایک ہی جملے میں

آسان لفظوں میں

حدیث ایک عجیب بات بتاتی ہے: ایسا شک جو یکبارگی نہیں آتا بلکہ ایک زنجیر کی صورت میں، ہر کڑی اگلی کو جنم دیتی ہے، یہاں تک کہ ایک ہی متعین سوال پر جا رکتی ہے: »پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟« اور پوری جدید الحاد میں یہی سب سے مشہور اعتراض ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ سوال نبی کریم ﷺ کے ماحول میں زیر بحث ہی نہ تھا۔ ان کے مخالف مشرک تھے، ملحد نہیں: وہ خالق کو مانتے تھے اور اس کے ساتھ دوسروں کو بھی پوجتے تھے - »اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے: اللہ نے«۔ جھگڑا اس پر تھا کہ عبادت کس کی ہو، اس پر نہیں کہ کوئی خالق ہے بھی یا نہیں۔ اور مکہ میں کسی کے بارے میں منقول نہیں کہ اس نے یہ سوال کیا ہو۔ یعنی حدیث ایک ایسے شبہ کا نقشہ کھینچ رہی ہے جو اس کے اپنے زمانے میں موجود ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہی سوال جدید الحادی اعتراض کا سب سے بڑا عنوان بن گیا۔ برٹرینڈ رسل نے 1927 میں اپنے خطبے »میں مسیحی کیوں نہیں ہوں« میں یہ اٹھایا اور اسی کو علتِ اولیٰ کی دلیل چھوڑنے کا سبب بنایا۔ اور رچرڈ ڈاکنز نے 2006 میں »وہمِ خدا« کے چوتھے باب - »خدا کیوں تقریباً یقینی طور پر نہیں ہے« - کا محور اسی کو بنایا، اپنی مشہور دلیل »حتمی بوئنگ 747« میں، جہاں وہ کہتا ہے کہ مصمم کا مفروضہ فوراً اس سے بڑا مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے: »اور مصمم کو کس نے بنایا؟«۔ ربا فلسفے کا جواب، تو وہ بعینہ وہی ہے جس کا حکم حدیث نے دیا: رک جانا۔ کیونکہ سوال اپنے اندر ایک منطقی خطا لیے ہوئے ہے - یہ فرض کر لیتا ہے کہ خالق مخلوق ہے، پھر اس کے خالق کے بارے میں پوچھتا ہے۔ اور جو زنجیر کبھی ختم نہ ہو وہ کچھ بھی نہیں سمجھاتی: اگر ہر چیز کو علت چاہیے، تو کوئی چیز کبھی وجود میں ہی نہیں آئے گی۔ منطق والے اسے تسلسلِ باطل کہتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حدیث میں تین چیزیں ایسی ہیں جن تک اندازہ نہیں پہنچ سکتا:

- 1 - شکل۔ یہ نہیں کہا کہ »لوگ اللہ کے بارے میں شک کریں گے« - یہ تو عام بات ہے جو ہر زمانے میں کہی جا سکتی ہے۔ بلکہ ایک زنجیر نما سوالیہ ساخت بیان کی: ایک سوال دوسرے کو کھینچتا ہے، دوسرا تیسرے کو۔
- 2 - انجام۔ اور جہاں یہ زنجیر جا رکتی ہے، اس آخری منزل کو بعینہ اس کے لفظوں میں متعین کر دیا۔ اور واقعی یہی آخری منزل ہے: اس رخ پر »اللہ کو کس نے پیدا کیا؟« کے بعد کوئی سوال باقی نہیں۔
- 3 - علاج۔ اور بحث کا حکم نہیں دیا، بلکہ زنجیر کاٹ دینے کا - اور یہی وہ منطقی جواب ہے جس تک فلسفہ صدیوں بعد پہنچا: خرابی سوال میں ہے، جواب میں نہیں۔

اور ایک حد کا ذکر ضروری ہے: یہ نفوس کے ایک ظاہرے کی خبر ہے، مادے کی کسی حقیقت کی نہیں؛ سو نہ اسے خوردبین ناپتی ہے نہ ترازو تولتا ہے۔ مگر یہ پوری طرح قابلِ تکذیب ہے: اگر یہ سوال اسی صیغے میں اور بحث کے اسی مقام پر ظاہر نہ ہوتا تو خبر باطل ہو جاتی۔ اور یہ ظاہر ہوا، اور صدی کی مشہور ترین الحادی کتاب کی مرکزی دلیل بن گیا۔ تو انہیں کس نے بتایا؟



تیسرا باب

تورات و انجیل کی بشارتیں



وہ متون جو آج تک اہل کتاب کی کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں، اور ایک آنے والے نبی کا ایسا وصف بیان کرتے ہیں جو پوری تاریخ میں صرف ایک ہی شخص پر صادق آتا ہے۔

11 دلائل

ان کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی

میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا

استثنا – باب 18، آیت 18

ان کے بھائیوں میں سے

بنی اسرائیل اسحاق سے
اور ان کے بھائی بنی اسماعیل
پس نبی عرب میں سے ہیں
بنی اسرائیل میں سے نہیں

موسیٰ کی مانند

مکمل شریعت
باپ اور ماں... پیدائش اور وفات
قائد، جنگجو اور قانون ساز
اور اپنی قوم کو لے کر ہجرت کی

اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا – جو وحی ہو، حرف بہ حرف کہتا ہے»

ایک ہی متن میں تین شرطیں: بھائیوں میں سے، موسیٰ کی مانند، اور وہی کہنے والا جو اُس پر ڈالا جائے

آسان لفظوں میں

اللہ موسیٰ علیہ السلام سے آنے والے نبی کا وعدہ کرتا ہے جس کی تین صفتیں ہیں: وہ بنی اسرائیل کے **بھائیوں** میں سے ہو گا، اُن میں سے نہیں؛ **موسیٰ کی مانند** ہو گا؛ اور **وہی کلام کہے گا جو اُس کے منہ میں رکھا جائے**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہود صدیوں تک اِس نبی کے منتظر رہے، اور جو بھی سامنے آتا اُس سے اِسی کے بارے میں پوچھتے۔ انجیل یوحنا میں ہے کہ اُنہوں نے یحییٰ علیہ السلام سے پوچھا: «کیا آپ ایلیاہ ہیں؟» کہا: نہیں۔ «کیا آپ وہ نبی ہیں؟» کہا: نہیں۔ – تو معلوم ہوا کہ «وہ نبی» ایک تیسرا متعین شخص تھا جس کا انتظار تھا، نہ مسیح اور نہ ایلیاہ۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

«ان کے بھائی» تورات کی زبان میں چچا زاد بھائیوں کو کہتے ہیں، سگے بھائیوں کو نہیں – اور بنی اسرائیل اسحاق علیہ السلام کی نسل سے ہیں، اور اُن کے بھائی بنی اسماعیل یعنی عرب ہیں۔ ربا «تیری مانند»، تو باریک مقابلہ محمد ﷺ ہی کو دیتا ہے: آپ کی ولادت ماں باپ سے عام طریقے پر ہوئی، آپ نے نکاح کیا اور اولاد ہوئی، آپ مکمل شریعت لے کر آئے، اپنی قوم کی قیادت کی، جنگ لڑی اور حکومت کی، اپنے شہر سے ہجرت کی، اور طبعی موت پائی۔ اور خود کتاب استثنا اِسی پر ختم ہوتی ہے: «اور اسرائیل میں پھر موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہ اٹھا» (10: 34) – یوں بنی اسرائیل کے سب انبیا مقابلے سے باہر ہو گئے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تیسری شرط ہی فیصلہ کن ہے: «اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا»۔ یہ اُس نبی کا وصف ہے جو حرف بہ حرف املا کرایا ہوا متن پڑھتا ہے، مفہوم نہیں۔ اور یہ بعینہ قرآن کا وصف ہے: «اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے؛ یہ تو بس وحی ہے جو اُتاری جاتی ہے»۔ اور محمد ﷺ پر سب سے پہلے جو اُترا وہ سیدھا تلقی کا حکم تھا: «پڑھو»۔ پھر تورات کا متن سخت تنبیہ پر ختم ہوتا ہے: «اور جو شخص میری اُن باتوں کو نہ سنے گا جو وہ میرے نام سے کہے گا، میں اُس سے حساب لوں گا»۔ تو یہ محض بشارت نہیں، بلکہ اتباع کا مطالبہ ہے۔

اگر کہا جائے کہ آیت 15 میں ہے «تیرے ہی درمیان سے، تیرے بھائیوں میں سے» – تو جواب یہ کہ آیت 18 غائب کے صبیغے «ان کے بھائیوں» کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور خود یہی کتاب ایک دوسری قوم کو بھائی کہتی ہے: «تمہارے بھائی بنی عیسو» (4: 2)۔ اور اگر بنی اسرائیل ہی میں حصر مقصود ہوتا تو یہ صراحت بڑھا دی جاتی، جیسے بادشاہ کے بارے میں بڑھائی گئی: «کوئی اجنبی جو تیرا بھائی نہیں» (15: 17)۔

اور کوہِ فاران سے جگمگایا

خداوند سینا سے آیا، اور سعیر سے اُن پر طلوع ہوا، اور کوہِ فاران سے جگمگایا، اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا

استثنا - باب 33، آیت 2



نور کے تین درجے: طلوع ہوا... پھر جگمگایا

آسان لفظوں میں

تورات کا ایک متن تین پہاڑوں کو ترتیب سے گنتا ہے: **سینا**، جہاں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا؛ پھر **سعیر** - ادوم کے پہاڑ، اور اُس کے طلوع کو مسیح علیہ السلام کی رسالت پر محمول کیا جاتا ہے - پھر **فاران**۔ اور فاران، خود تورات کی تصریح سے، وہی سرزمین ہے جہاں اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی اولاد آباد ہوئی: مکہ اور اُس کا نواح۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہود و نصاریٰ ہزاروں برس سے یہ متن اپنی کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ اور جو گرہ اُن کے ہاں کبھی نہ کھلی وہ یہ ہے: **تیسرا واقعہ کیا ہے؟** خداوند کا سینا سے آنا تورات ہے، اور سعیر سے اُس کا طلوع انجیل - تو فاران سے کیا جگمگایا؟ اور اُس خطے میں اُن دونوں کے ہم پلہ کوئی دینی واقعہ پیش نہیں آیا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

فاران خود تورات میں ایک متعین مقام ہے۔ کتابِ پیدائش (21: 21) میں اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں ہے: «اور وہ **فاران** کے بیابان میں رہنے لگا، اور اُس کی ماں نے مصر کی سرزمین سے اُس کے لیے بیوی لی»۔ تو خود اُن کی تصریح سے یہ اولادِ اسماعیل کا وطن ہے۔ مسلمان جغرافیہ دان اور بائبل کی لغتیں بیابانِ فاران کو شمالی حجاز اور جزیرہ نمائے سینا اور ان دونوں کے درمیانی علاقے میں متعین کرتی ہیں۔ اور اُس بیابان سے عالمی رسالت لے کر محمد ﷺ کے سوا کوئی نبی نہیں نکلا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دلالت کا محل افعال کی تدریج ہے، اور یہ عبرانی میں قصداً ہے: «آیا» پھر «طلوع ہوا» پھر «جگمگایا» - اور جگمگانا نور کا سب سے قوی اور سب سے زیادہ پھیلنے والا درجہ ہے۔ تو متن تین رسالتوں کو چڑھتی ترتیب میں رکھتا ہے اور آخری کو سب سے زیادہ روشن ٹھہراتا ہے۔ پھر اس پر یہ بڑھاتا ہے: «اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا، اور اُس کے دہنے ہاتھ اُن کے لیے آتشی شریعت تھی» - یعنی اس آخری آمد کے ساتھ **شریعت** ہے، محض موعظت نہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد محمد ﷺ ہی اکیلے وہ نبی ہیں جو عبادت، معاملات اور قضا سب پر حاکم مکمل شریعت لے کر آئے۔

اللہ تیمان سے آیا، اور قدّوس کوہِ فاران سے۔ اُس کے جلال نے آسمانوں کو ڈھانپ لیا، اور زمین

اُس کی تسبیح سے بھر گئی

حقوق - باب 3، آیت 3



کوہِ فاران - تورات کی تصریح سے اسماعیل علیہ السلام کا وطن - جس کا ذکر ایک عبرانی نبی مسیح سے پہلے کرتا ہے

آسان لفظوں میں

بنی اسرائیل کے انبیا میں سے ایک نبی کہتا ہے کہ قدّوس کوہِ فاران سے آئے گا - اور فاران، خود تورات کی تصریح سے، وہی بیابان ہے جہاں اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی اولاد آباد ہوئی۔ اور متن اِس کے ساتھ ادوم کے کناروں پر واقع تیمان کو ملاتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ متن اہل کتاب کے ہاں ہمیشہ تفسیر پر بھاری رہا۔ نہ تیما بنی اسرائیل کی سرزمین ہے نہ فاران، اور اُن کی تاریخ میں اِن دونوں سے کوئی نبی نہیں نکلا۔ بعضوں نے اِسے سینا میں اللہ کی آمد کا شاعرانہ وصف قرار دینے کی کوشش کی - لیکن یہاں سینا کا سرے سے ذکر ہی نہیں، اور فاران کا نام لے کر ذکر ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

تیماء آج شمال مغربی سعودی عرب کا ایک مشہور نخلستان اور آثارِ قدیمہ کا شہر ہے، جو حجاز اور شام کے درمیان قافلوں کے راستے پر ایک بڑا پڑاؤ تھا، اور وہاں مسیح سے پہلے کے آثار اور کتبے موجود ہیں۔ اور فاران اسماعیل علیہ السلام کا بیابان ہے، جیسا کہ کتابِ پیدائش نے تصریح کی۔ تو متن ادوم سے مشرق کی طرف بیابانِ اسماعیل کی جانب بڑھتا ہے - اور اُس بیابان سے عالمی رسالت لے کر محمد ﷺ کے سوا کوئی نبی نہیں نکلا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

جو چیز اِس متن کو محض احتمال سے اوپر اٹھاتی ہے وہ دو باتیں ہیں۔ پہلی: یہ کہ وہ فاران کے ذکر میں استثنا کے متن سے مطابق ہے - دو مختلف نبی، دو مختلف زمانوں میں، اُسی ایک مقام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اور دو مستقل گواہوں کا ایسے مقام پر جمع ہو جانا جو اُن کی اپنی سرزمین سے باہر ہے، قوی دلالت ہے۔ دوسری: متن کا بقیہ حصہ: «اور زمین اُس کی تسبیح سے بھر گئی» - یعنی اِس آمد کا اثر عالمی ہے، مقامی نہیں۔ اور اُس سرزمین سے اسلام کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں نکلی جس نے زمین کو تسبیح سے بھر دیا ہو، کہ اُسی کے ذریعے دن کی ہر گھڑی میں ہر براعظم میں اذان اور تسبیح بلند ہوتی

قیدار کی بستیاں... اور سالع کے باشندے

بیابان اور اُس کی بستیاں اپنی آواز بلند کریں، وہ بستیاں جن میں قیدار بستا ہے۔ سالع کے

باشندے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں

یسعیاہ – باب 42، آیت 11

تورات میں «قیدار» کون ہے؟

- قیدار اسماعیل کا دوسرا بیٹا ہے
- «اور یہ اسماعیل کے بیٹوں کے نام ہیں... نابیوت اور قیدار»
- پیدائش 25: 13
- اور قریش قیدار بن اسماعیل کی نسل سے

پس نیا گیت عرب کے دیار سے بلند ہوتا ہے

اور سالع: مدینہ منورہ کے قریب ایک جگہ، آج بھی اسی نام سے

یسعیاہ قیدار کی بستیوں کو نیا گیت گانے کو پکارتا ہے

آسان لفظوں میں

یسعیاہ کہتا ہے: بیابان اپنی آواز بلند کرے، وہ بستیاں جن میں قیدار بستا ہے۔ اور قیدار – تورات کی تصریح سے – اسماعیل علیہ السلام کا بیٹا ہے، اور اُن عدنانی عربوں کا جدِ اعلیٰ جن میں سے قریش ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یسعیاہ کا بیالیسواں باب ایک «بندے» کا ذکر کرتا ہے جسے اللہ چنتا ہے، جو قوموں کے لیے عدل لاتا ہے، اور جو نہ تھکتا ہے نہ ٹوٹتا ہے یہاں تک کہ زمین پر حق قائم کر دے۔ اہل کتاب اُس کی تعین میں ہمیشہ اختلاف کرتے رہے۔ لیکن خود متن جگہ متعین کر دیتا ہے: قیدار کی بستیاں اور سالع۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

«قیدار» کا ذکر کتابِ پیدائش (25: 13) میں اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کے ضمن میں ہے۔ اور عدنانی عرب – اور اُن میں قریش اور بنو ہاشم – اُسی کی نسل سے ہیں۔ اور شمالی جزیرہ نما کے علاقے کو آشوری کتبوں میں واقعی «قیدار» کے نام سے پکارا گیا ہے۔ رہا «سالع»، تو وہ ایک معروف مقام ہے: مدینہ منورہ سے متصل کوہِ سلع، جس کے پاس خندقِ احزاب کھودی گئی، اور جو آج تک اسی نام سے قائم ہے۔

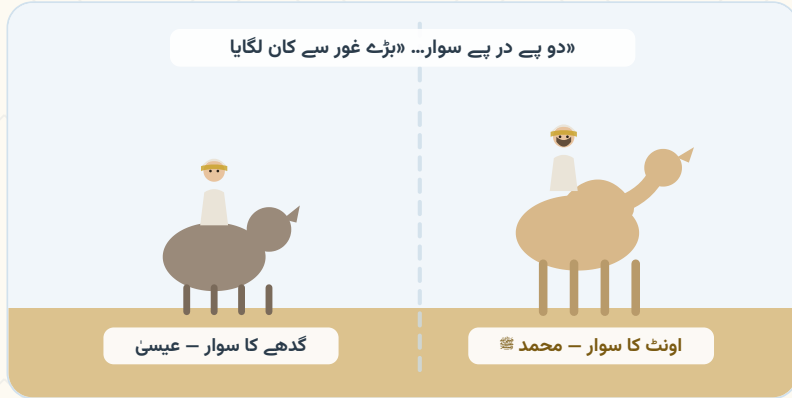
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

متن پہلی آیت میں «میرا بندہ جسے میں سنبھالتا ہوں» کے وصف سے شروع ہوتا ہے – اور «بندہ» وہ لقب ہے جو قرآن میں محمد ﷺ کے ساتھ لگا رہتا ہے: «پاک ہے وہ جو اپنے بندے کو رات میں لے گیا»، «اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُسے پکارنے کھڑا ہوا»۔ پھر دسویں آیت میں کہتا ہے: «خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ» – یعنی نئی شریعت، نہ کہ پرانی کی تجدید۔ پھر اس گیت والوں کو متعین کرتا ہے: قیدار کی بستیاں اور سالع کے باشندے – اور یہ دونوں خالص عربی مقام ہیں، ایک قریش کا نسب اور دوسرا مدینہ منورہ کا پہاڑ۔ ایک ہی متن میں نبی ﷺ کا نسب، آپ کی ہجرت کا شہر، آپ کا وصف «بندہ»، اور نئی شریعت کی دعوت – اتنی چیزوں کا جمع ہو جانا اتفاق کا احتمال نہیں رکھتا۔

گدھے کا سوار اور اونٹ کا سوار

تو اُس نے سوار دیکھے، گھڑ سواروں کے جوڑے، گدھوں کے سوار، اونٹوں کے سوار؛ پس اُس نے
بڑے غور سے کان لگایا

یسعیاء - باب 21، آیت 7



ایک متن جو دو خاص سواروں کا ذکر کرتا ہے اور اُن کی بات سننے کا حکم دیتا ہے

آسان لفظوں میں

کتابِ یسعیاء میں ایک رؤیا ہے جس میں نبی **دو سوار** دیکھتا ہے: ایک گدھے پر اور دوسرا اونٹ پر، اور اُسے حکم دیا جاتا ہے کہ اُن کی طرف بڑے غور سے کان لگائے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اہل کتاب کے ہاں اِس متن کی تفسیر یہ کی گئی کہ یہ بابل کے زوال کی رؤیا ہے۔ لیکن خود منظر عجیب ہے: دو ممتاز سوار جن کا ذکر اُن کی سواریوں کے ساتھ ہو، اور نبی کو اُن کی بات سننے کا حکم دیا جائے - اور کان تو کسی پیغام کے لیے لگایا جاتا ہے، جنگ کی خبر کے لیے نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

گدھے کا سوار ایک ایسی نشانی ہے جسے اہل کتاب مسیح علیہ السلام کے لیے پہچانتے ہیں۔ کتابِ زکریا (9: 9) میں آیا ہے: «دیکھ، تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے... حلیم، اور گدھے پر سوار»، اور اناجیل نے مسیح علیہ السلام کا گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہونا اِسی پیشین گوئی کی تکمیل کے طور پر نقل کیا ہے۔ تو اگر پہلا مسیح علیہ السلام ثابت ہو گیا، تو **اونٹ کا سوار** کون ہے جو اُن کے بعد آیا، اور جس کی طرف کان لگانے کا نبی کو ویسے ہی حکم دیا گیا جیسے پہلے کی طرف؟ اونٹ عربوں کی سواری ہے، اور مسیح علیہ السلام کے بعد اہل اونٹ میں سے محمد ﷺ کے سوا کوئی نبی نہیں آیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قوتِ **اقتراں اور ترتیب** میں ہے۔ اونٹ کے سوار کا ذکر اکیلا نہیں کیا گیا کہ کہا جا سکے یہ کسی قافلے کی طرف عام اشارہ ہے - بلکہ اُسے گدھے کے سوار کے ساتھ ایک ہی منظر میں، اور اُس کے فوراً بعد ملایا گیا۔ اور اہل کتاب یہ مان چکے ہیں کہ «گدھے کا سوار» ایک متعین شخص کی نبوی نشانی ہے - تو یہ درست نہیں بیٹھتا کہ اُسی متن میں اُس کا ساتھی محض ایک بے معنی تفصیل ہو۔ اور کان لگانے کا حکم - «پس اُس نے بڑے غور سے کان لگایا» - بتاتا ہے کہ جو آنے والا ہے وہ **سنا اور مانا جانے والا کلام** ہے، نہ کہ دیکھا جانے والا منظر۔ اور اِسی باب کا بقیہ حصہ «عرب کے بارے میں وحی» کا ذکر کرتا ہے، اور ددان اور تیما اور «قیدار کے جلال» کا - تو سارا سیاق ہی عربی ہے۔

میں لکھنا نہیں جانتا

اور کتاب اُس کو دی جاتی ہے جو لکھنا نہیں جانتا، اور اُس سے کہا جاتا ہے: یہ پڑھ؛ تو وہ

کہتا ہے: میں لکھنا نہیں جانتا

یسعیاء – باب 29، آیت 12



ایک منظر جو پیش آنے سے ہزار برس سے بھی پہلے بیان کر دیا گیا

آسان لفظوں میں

یسعیاء کا ایک متن ایک منظر بیان کرتا ہے: ایک کتاب ایسے شخص کو دی جاتی ہے جو پڑھنا نہیں جانتا، اور اُس سے کہا جاتا ہے: «یہ پڑھ»۔ وہ جواب دیتا ہے: «میں لکھنا نہیں جانتا»۔ اور بعینہ یہی غارِ حرا میں پیش آیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ متن نبی ﷺ کی ولادت سے صدیوں پہلے اہل کتاب کی کتابوں میں موجود تھا، اور اس کا کوئی مصداق نہ تھا جس کی طرف اشارہ کیا جاسکے۔ اور وہ اسے بنی اسرائیل کے اپنی ہی کتاب کی سمجھ سے اندھے ہونے کے رمزی معنی پر محمول کرتے تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

غارِ حرا میں، سنہ 610 عیسوی میں، جبریل علیہ السلام محمد ﷺ کے پاس آئے اور کہا: «پڑھو»۔ آپ نے فرمایا: «میں پڑھنے والا نہیں ہوں»۔ انہوں نے آپ کو بھینچا، پھر کہا: «پڑھو»۔ آپ نے فرمایا: «میں پڑھنے والا نہیں ہوں» – تین بار۔ پھر یہ اُترا: «پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا»۔ اور یہ قصہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہے، اور سیرت کی سب سے مشہور اور سب سے ثابت چیزوں میں سے ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

مطابقت صرف معنی میں نہیں، بلکہ پورے منظر کی ساخت میں ہے: پڑھنے کا حکم، اور اُس سے عاجزی کا جواب، ایک ایسے شخص کی طرف سے جو پڑھتا نہیں۔ اور یہ ایک ناگزیر شرط کا تقاضا کرتا ہے: وہ موعود نبی امی ہو، نہ پڑھے نہ لکھے۔ اور یہی وہ صفت ہے جس کی قرآن محمد ﷺ کے بارے میں تصریح کرتا ہے اور اُسے دلیل بناتا ہے: «اور آپ اِس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، ورنہ باطل والے ضرور شک میں پڑ جاتے»۔ اور غور کیجیے کہ امی ہونا یہاں کوئی نقص نہیں، بلکہ خود برہان ہے: اگر آپ پڑھے لکھے ہوتے تو کہا جاتا کہ نقل کیا اور اُتار لیا۔ اور یسعیاء کا متن اِسی عاجزی کو نشانی قرار دیتا ہے، عیب نہیں۔

حِکْمُو مَتَّقِیْمٍ وَکُلُو مَحْمَدِیْمٍ، زِیْہ دودی وَزِیْہ رِعی، بِنُوتِ یَروشلَیْم

غزل الغزلات – باب 5، آیت 16 (عبرانی متن)

اصل عبرانی متن

מַחְמַדִּימ

تلفظ: مَحْمَدِیْم

»اور عربی میں ترجمہ ہوا: «مشتہیات

نام متن میں موجود ہے... اور ترجمے میں غائب

عبرانی لفظ بعینہ اسی طرح جیسے وہ آج کے معتمد نسخوں میں ہے

آسان لفظوں میں

غزل الغزلات کے عبرانی متن میں لفظ **»مَحْمَدِیْم«** آتا ہے – اور اِس کا عبرانی مادہ «T-D-N» وہی عربی مادہ «ح م د» ہے جس سے «محمد» اور «احمد» بنے ہیں۔ اور اردو ترجموں میں اِسے «دلپسند» یا «پسندیدہ» کر دیا جاتا ہے، تو مادہ اُس میں گھل جاتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

غزل ایک محبوب کو شاعرانہ تصویر میں بیان کرتی ہے، اور اُس کے اوصاف اِسی لفظ پر ختم ہوتے ہیں: «اُس کا دہن شیرینی ہے، اور وہ سراسر مَحْمَدِیْم ہے»۔ اور اِس متن کو اللہ اور اُس کی قوم کے تعلق کا رمز سمجھا گیا، یا محض محبت کا شعر۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عبرانی میں لاحقہ «یْم» جمع کے لیے بھی ہے اور تعظیم کے لیے بھی – جیسے «الوہیم» میں، جو اللہ کا نام جمع کے صیغے میں ہے اور مراد ایک ہی ہے۔ اور اِس لفظ کا عبرانی مادہ «T-D-N» (ح م د) وہی عربی مادہ «ح م د» ہے۔ مگر یہاں «یْم» معتمد تجزیے میں عام جمع ہے، جیسے اِسی آیت میں «مَتَّقِیْم»۔ اور یہیں حد پر رک جائیے: اِسے «محمد» کا اسم علم پڑھنا ایک استنباط ہے، نحوی حکم نہیں۔ اور جو بات ثابت ہے وہ یہ کہ مادہ آج تک عبرانی میں قائم ہے، اور ترجمے اُسے یوں گھلا دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اُسے دیکھ ہی نہیں پاتا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دلیل کا محل یہ ہے کہ مادہ اصل میں باقی ہے، حذف نہیں ہوا – بس ترجمے میں گھل گیا ہے۔ اور ایسا بہت ہوتا ہے: اسمائے اعلام اگر اپنی زبان میں کوئی معنی رکھتے ہوں تو کبھی ترجمہ ہو جاتے ہیں اور نام گم ہو جاتا ہے۔ اگر «عبد اللہ» کا نام کسی عربی متن میں ہوتا تو اُس کا ترجمہ «اللہ کا بندہ» کر دیا جاتا اور وہ شخص غائب ہو جاتا۔ اور قرآن نے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کا نام اُن کے ہاں مذکور ہے: «جو اُس رسول، نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں»، اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام نے «ایک رسول کی بشارت دی جو میرے بعد آئے گا، اُس کا نام احمد ہے»۔ تو یہ قرآن کا دعویٰ ہے، اور یہ عبرانی لفظ ایک گواہ ہے جو اُسے قریب کرتا ہے – کوئی ایسی دلیل نہیں جو تنہا فیصلہ کر دے۔

تم سے لے لی جائے گی اور دوسری قوم کو دی جائے گی

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں: اللہ کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور ایسی قوم کو دی جائے گی جو اُس کے پہل لائے

انجیل متی - باب 21، آیت 43

متن ایک امت کی بات کرتا ہے، بنی اسرائیل کے گروہ کی نہیں

بنی اسرائیل
نبوت اُن میں
لگاتار صدیوں تک
«تم سے چھن جائے گی»



دوسری امت
«جو اُس کے پہل لائے»
اُن کی نسل سے نہیں
«اور ایک قوم کو دی جائے گی»

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کا پتھر بنا

نبوت کا ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف منتقل ہونا... خود انجیل کی تصریح سے

آسان لفظوں میں

مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اللہ کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور دوسری قوم کو دی جائے گی جو وہ کرے گی جو اُسے راضی کرے۔ یعنی نبوت بنی اسرائیل سے نکل کر دوسروں کی طرف چلی جائے گی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

نبوت بنی اسرائیل میں - جو یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں - صدیوں تک لگاتار رہی: یوسف، موسیٰ، ہارون، داؤد، سلیمان، یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل اور دوسرے علیہم السلام۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اُن کی نسل میں محفوظ ایک حق ہے جو کبھی اُن سے باہر نہیں جائے گا۔ اسی لیے اُنہوں نے یہ ماننے سے انکار کیا کہ کوئی نبی عربوں میں سے بھیجا جائے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

محمد ﷺ بنی اسماعیل میں سے مبعوث ہوئے - یعنی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی دوسری شاخ سے۔ تو نبوت تاریخ میں پہلی بار بنی اسحاق سے نکل کر بنی اسماعیل کی طرف گئی۔ اور آپ کے ہاتھ پر ایک نئی امت کھڑی ہوئی جو پہلے موجود نہ تھی، اور زمین کے سب براعظموں میں پھیل گئی۔ اور قرآن نے اُس حسد کی طرف اشارہ کیا ہے جو ٹھیک اسی مقام پر پیدا ہوتا ہے: «یا وہ لوگوں سے اُس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے اُنہیں اپنے فضل سے دیا ہے؟»۔

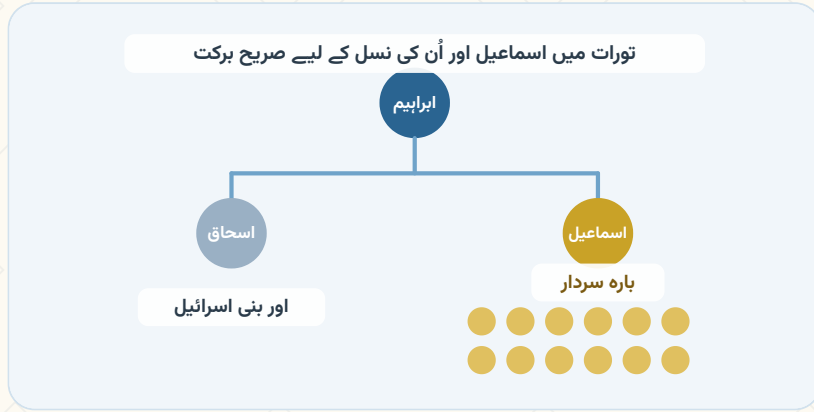
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

لفظ «قوم» ہی فیصلہ کن ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ «تم میں سے کسی گروہ کو دی جائے گی» اور نہ «کسی صالح بقیے کو» - بلکہ کہا گیا «ایک قوم کو»، اور یونانی میں یہ لفظ (ἔθνος) ایک دوسرے لوگ کے معنی میں ہے۔ اور اِس متن سے پہلے انگور کے باغ کی مثال آتی ہے جس کے کام کرنے والوں نے بھیجے ہوئے قاصدوں کو قتل کیا، پھر بیٹے کو قتل کیا، تو وہ اِس کے مستحق ٹھہرے کہ باغ اُن سے لے کر دوسروں کے سپرد کر دیا جائے۔ اور بالکل اِس سے پہلے یہ ہے: «جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا» (آیت 42)، پھر اِسی پر حرف تعلیل کے ساتھ حکم کی شاخ نکالی گئی: «اس لیے میں تم سے کہتا ہوں...» (آیت 43) - یعنی وہی رد کی ہوئی شاخ ہے جس پر عمارت کھڑی ہو گی۔ اور بنی اسماعیل وہی شاخ ہیں جو نبوت کے تمام دفتروں میں نظرانداز رہی - یہاں تک کہ خاتم الانبیا اُسی میں سے آئے۔

بارہ سردار... اور ایک بڑی قوم

اور رہا اسماعیل، تو اُس کے حق میں بھی میں نے تیری سن لی۔ دیکھ، میں اُسے برکت دوں گا اور برومند کروں گا
❖ اور بہت ہی زیادہ بڑھاؤں گا۔ اُس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے، اور میں اُسے ایک بڑی قوم بناؤں گا

پیدائش — باب 17، آیت 20



ایک متن جو اسماعیل کے لیے برکت، نسل اور بڑی قوم ثابت کرتا ہے

آسان لفظوں میں

خود تورات ذکر کرتی ہے کہ اللہ نے اسماعیل علیہ السلام کو برکت دی، اور وعدہ کیا کہ اُن کی پشت سے بارہ سردار نکلیں گے، اور وہ انہیں ایک بڑی قوم بنائے گا۔ تو برکت اکیلے اسحاق علیہ السلام تک محدود نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بنی اسرائیل میں یہ بات پھیلی ہوئی تھی کہ سارا وعدہ اسحاق علیہ السلام اور اُن کی نسل میں ہے، اور اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی اولاد عہد سے باہر ہیں۔ اور اِسی بنیاد پر ہر اُس نبوت کو رد کیا گیا جو عربوں کی جانب سے آئے۔ لیکن متن اسماعیل علیہ السلام کے لیے ایک مستقل برکت ثابت کرنے میں صریح ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے کتابِ پیدائش (25: 13-16) میں نام لے کر مذکور ہیں، اور فہرستِ اس قول پر ختم ہوئی: «اپنے اپنے قبیلوں کے مطابق بارہ سردار» — اور یہ شمالی عرب کے معروف قبیلے ہیں، اور ان میں سے کئی کے نام آشوری کتبوں میں آئے ہیں۔ رہا «بڑی قوم» کا وعدہ، تو وہ اسلام سے پورا ہوا: ایک امت جو اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے نکلی اور زمین کے مشرق و مغرب تک پہنچی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ متن اُس بنیادی دلیل ہی کو باطل کر دیتا ہے جس سے محمد ﷺ کی نبوت رد کی گئی۔ اگر خود تورات اسماعیل علیہ السلام کے لیے برکت اور عظیم نسل اور ایک بڑی قوم ثابت کرتی ہے، تو اُن کی شاخ کو نبوت سے نکال باہر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور وعدے کی ترتیب پر غور کیجیے: برکت، پھر برومندی اور کثرت، پھر بارہ سرداروں میں ریاست، پھر «ایک بڑی قوم» — اور یہی وہ غایت ہے جس پر وعدہ ختم ہوا۔ اور کتابِ پیدائش (21: 21) نے تصریح کی ہے کہ اسماعیل علیہ السلام بیابانِ فاران میں آباد ہوئے — اور یہی وہ مقام ہے جس سے استثنا کے متن میں نور «جگمگایا»۔ تو یہ متون ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں اور ایک ہی سمت میں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

موسیٰ جیسا... وہ موازنہ جو فیصلہ کر دیتا ہے

اور بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند پھر کوئی نبی نہ اٹھا، جسے خداوند نے روبرو ہو کر جانا

استثنا – باب 34، آیت 10

وصف	موسیٰ	محمد ﷺ
طبعی ولادت	✓	✓
باپ اور ماں	✓	✓
بیوی اور اولاد	✓	✓
مکمل شریعت	✓	✓
قائد اور جنگجو	✓	✓
انہ شہر سے بخت	✓	✓
تیری مانند» – اور تورات اسے بنی اسرائیل سے خارج کرتی ہے»		

سات صفتیں جو دو میں جمع ہیں اور کسی تیسرے میں نہیں

آسان لفظوں میں

تورات نے ایک ایسے نبی کا وعدہ کیا جو **موسیٰ جیسا** ہو۔ اور جب آپ موازنہ کرتے ہیں تو یہ صفتیں محمد ﷺ میں جمع ملتی ہیں اور کسی دوسرے نبی میں نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اہل کتاب «موسیٰ جیسے نبی» کا انتظار کرتے رہے اور کبھی متفقہ طور پر اُس کا تعین نہ کر سکے۔ بنی اسرائیل کے جن انبیاء کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا، اُن میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی شرط کم رہ جاتی ہے: نہ اُن کے پاس کوئی نئی شریعت تھی، نہ کسی ریاست کی قیادت، نہ جنگ۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

موسیٰ اور محمد ﷺ کے درمیان مشابہت کے پہلو یہ ہیں: ماں باپ سے عام پیدائش، ازدواجی زندگی اور اولاد، ایک **مکمل شریعت** جو عبادت، معاملات، قضا اور حدود پر حکم چلاتی ہے، ایک اُمت کی قیادت، جہاد اور حکومت، ظلم کی سرزمین سے تمکین کی سرزمین کی طرف **ہجرت**، اپنی زندگی ہی میں دشمنوں پر فتح، اور طبعی موت اور زمین میں تدفین۔ یہ سب موسیٰ کے بعد کسی اور نبی میں جمع نہیں ہوتیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تورات نے خود دروازہ بند کر دیا: «اور بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند پھر کوئی نبی نہ اٹھا»۔ یہ صاف گواہی ہے کہ موعود نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں، ورنہ عبارت خود اپنی تردید کر بیٹھتی۔ اور جب اسے باب 18 کی آیت 18 کے ان الفاظ کے ساتھ ملایا جائے – «اُن کے بھائیوں میں سے» – تو نتیجہ لازماً نکلتا ہے: ایک نبی اُن کے چچا زاد بھائیوں، یعنی بنی اسماعیل میں سے۔ یہود قدیم زمانے میں یہ سمجھتے تھے؛ اسی لیے قرآن میں آیا: «اور اس سے پہلے وہ کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے، پھر جب اُن کے پاس وہ چیز آ گئی جسے وہ پہچانتے تھے تو اُس کا انکار کر بیٹھے» – یعنی وہ اُس کا انتظار کرتے اور اُس کی بشارت دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ اُن کی اپنی نسل سے باہر سے آ گیا۔

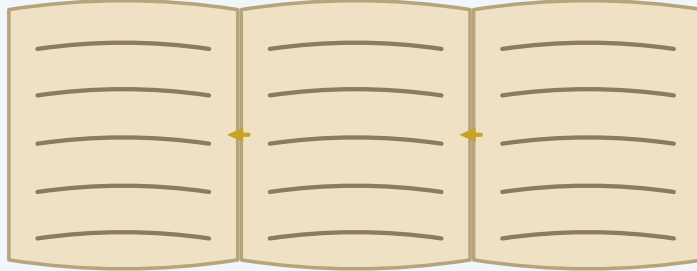
وہ اُسے اپنے ہاں لکھا پاتے ہیں

جو لوگ اُس رسول، نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا

ہوا پاتے ہیں

سورہ اعراف – آیت 157

مخالفوں کی کتابوں کا حوالہ دینے والا متن – اور جھٹلانے کا چیلنج



قرآن اہل کتاب کے اپنے باتھوں میں موجود کتابوں کو گواہ بناتا ہے، اکیلے اپنے آپ کو نہیں

آسان لفظوں میں

قرآن صاف کہتا ہے کہ نبی ﷺ کا وصف **تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ہے** – انہی کتابوں میں جو اہل کتاب کے باتھوں میں ہیں۔ یہ اُن کے لیے کھلا چیلنج ہے کہ اپنی کتابیں کھولیں اور دیکھ لیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مدینہ، نجران اور یمن کے یہود و نصاریٰ اپنی کتابیں رکھتے تھے اور انہیں پڑھتے تھے، اور اُن میں ایسے علما بھی تھے جو ان نصوص کے ماہر تھے۔ چنانچہ یہ دعویٰ کہ نبی ﷺ کا وصف اُن کی کتابوں میں موجود ہے، اُسی دن جھٹلایا جا سکتا تھا اگر اُس کی کوئی بنیاد نہ ہوتی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جو نصوص ابھی گزرے – استثنا 18 اور 33، حبقوق 3، یسعیاہ 21، 29 اور 42، غزل الغزلات 5، یوحنا 14 اور 16، متی 21، اور پیدائش 17 اور 21 – **یہ سب آج کے مستند نسخوں میں موجود ہیں**، اور کوئی بھی پڑھنے والا کتاب کھول کر انہیں پڑھ سکتا ہے۔ اور آیت نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہر مقام پر نام صراحتاً درج ہے، بلکہ کہا **»وہ اُسے پاتے ہیں«** – یعنی وہ اُس کا وصف اور اُس کی نشانیاں پاتے ہیں اور انہی سے اُسے پہچان لیتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قوّت یہاں ایک الگ قسم کی ہے۔ قرآن اپنے آپ سے دلیل نہیں لاتا، بلکہ **مخالف کی اپنی کتاب کا حوالہ دیتا ہے**۔ یہ سب سے خطرناک قسم کی دلیل ہے اور سب سے آسانی سے جھٹلائی جانے والی – بس اتنا کافی تھا کہ وہ اپنی کتابیں کھولتے اور انہیں خالی دکھا دیتے۔ اِس کے باوجود اُن کے جن علما نے اسلام قبول کیا، اِسی وجہ سے کیا – جیسے مدینہ کے یہود کے عالم عبداللہ بن سلام۔ پھر قرآن نے جرأت میں اور اضافہ کیا: **»وہ اُسے ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں«** – ایسا موازنہ وہی کہہ سکتا ہے جو پورا یقین رکھتا ہو۔ اور ان نصوص کا چودہ صدیوں تک اُن کی کتابوں میں باقی رہنا، جنہیں محققین پڑھتے اور اُن پر بحث کرتے رہے، خود آج تک اُسی چیلنج کا جاری رہنا ہے۔



چوتھا باب

نبی ﷺ کے حسی معجزات

وہ کچھ جو آپ کے صحابہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور متصل سندوں کے ساتھ ہم تک پہنچایا: انگلیوں سے پھوٹتا ہوا پانی، آپ کے شوق میں رونے والا کھجور کا تنا، اور مکہ کے اوپر دو ٹکڑے ہوتا ہوا چاند۔

16 دلائل

چاند مکہ کے اوپر پھٹ گیا

قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا ﴿۱﴾ اور اگر وہ نشانی دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے

ہیں: چلتا ہوا جادو

سورہ قمر – آیات 1-2



ایک ایسا واقعہ جسے سب اہل مکہ نے دیکھا – مومن بھی اور منکر بھی

آسان لفظوں میں

چاند آسمان میں دو ٹکڑے ہو گیا، یہاں تک کہ لوگوں نے جبلِ حرا کو ان کے درمیان دیکھا۔ اور مشرکوں نے دیکھنے سے انکار نہیں کیا – انہوں نے کہا: «محمد نے ہم پر جادو کر دیا»۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قریش نبی کریم ﷺ سے کوئی محسوس نشانی مانگتے تھے جو ان کی سچائی ثابت کرے۔ جب وہ واقع ہو گئی تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ «ہم نے کچھ نہیں دیکھا» – حالانکہ یہی سب سے آسان اور سب سے محفوظ جواب تھا – بلکہ جو دیکھا تھا اس کی تاویل جادو سے کر دی۔ اور یہ بجائے خود دیکھ لینے کا اقرار ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

آیت ماضی محقق کے صیغے میں اتری: «چاند پھٹ گیا» – نہ کہ «پھٹے گا»۔ اور شقِ قمر کی حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں متعدد سندوں سے صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے: ابن مسعود، انس، ابن عباس، اور مسلم میں ابن عمر۔ جبیر بن مطعم کی حدیث احمد اور حاکم نے روایت کی اور حاکم نے شیخین کی شرط پر اسے صحیح کہا۔ ابن مسعود کی حدیث میں اس کا نقشہ بھی ہے جو انہوں نے دیکھا: «یہاں تک کہ انہوں نے پہاڑ کو چاند کے دو ٹکڑوں کے درمیان دیکھا»۔ اور محدثین کے نزدیک یہ خبر حدِ تواتر کو پہنچ چکی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

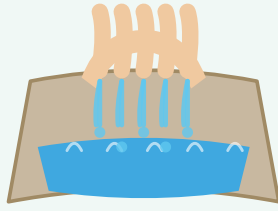
دلیل یہاں صرف واقعے میں نہیں، بلکہ مخالفوں کے ردعمل میں ہے۔ آیت انہی کے سامنے مکہ میں پڑھی جا رہی تھی جب وہ زندہ تھے، اور یہ طے کر رہی تھی کہ چاند ان کی آنکھوں کے سامنے پھٹا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو ان کے لیے سب سے آسان بات یہ تھی کہ کہہ دیتے: «کب؟ ہم نے تو نہیں دیکھا»۔ اور وہ سب سے بڑھ کر ان کی تکذیب کے حریص تھے، اور انہیں شاعری، جادو اور جنون کا الزام دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ مگر انہوں نے انکار کے بجائے تاویل کو چنا – اور ممکنہ گواہیوں میں یہ سب سے قوی گواہی ہے۔ اور خود آیت نے ان کا جواب بھی درج کر لیا: «اور کہتے ہیں: چلتا ہوا جادو» – یوں دلیل اور اس کا جواب دونوں محفوظ ہو گئے۔

انگلیوں کے درمیان سے پھوٹتا پانی

پھر آپ نے اپنا ہاتھ اس برتن میں رکھا، تو پانی آپ کی انگلیوں کے درمیان سے چشموں کی طرح ایلنے لگا، سو ہم نے پیا اور وضو کیا۔ انس سے پوچھا گیا: تم کتنے تھے؟ کہا: تقریباً تین سو

بخاری اور مسلم نے روایت کیا – متفق علیہ

برتن سے نہیں پھوٹا... بلکہ انگلیوں کے بیچ سے



تقریباً تین سو آدمیوں نے ایک برتن سے پیا اور وضو کیا

ایک منظر جسے انس بن مالک، جابر، ابن مسعود اور دیگر نے روایت کیا

آسان لفظوں میں

پانی ختم ہو گیا اور لوگ پیاسے تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ ایک چھوٹے برتن میں رکھا، اور پانی ان کی انگلیوں کے درمیان سے چشموں کی طرح پھوٹ پڑا، یہاں تک کہ سارے لشکر نے پیا اور وضو کیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اس موقع پر نہ کوئی کنواں تھا نہ بارش۔ اور صحرا میں پانی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ سینکڑوں لوگوں کو ایک ہی وقت میں پانی درکار تھا۔ اور وہ چھوٹا برتن ایک آدمی کے وضو اور پینے کو بھی کافی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ واقعہ صحیحین میں انس بن مالک، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن مسعود اور دوسروں سے مختلف مقامات پر مروی ہے – حدیبیہ، تبوک اور ان کے علاوہ۔ اور یہ ایک سے زیادہ بار پیش آیا، اور ہزاروں نے اسے دیکھا۔ ابن مسعود کہتے ہیں: «ہم نشانیوں کو برکت شمار کرتے تھے اور تم انہیں خوف شمار کرتے ہو۔ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، پانی کم پڑ گیا تو آپ نے فرمایا: تھوڑا سا بچا ہوا پانی تلاش کرو...»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فرق کرنے والی تفصیل پھوٹنے کی جگہ ہے: «ان کی انگلیوں کے درمیان سے»، برتن سے نہیں۔ اگر کسی کو خبر گھڑنی ہوتی تو زیادہ قریب یہ تھا کہ کہہ دیتا برتن بھر گیا – یہ سادہ تر بات ہے۔ رہا انسانی ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی کا پھوٹنا، تو یہ ایک عجیب اور باریک نقشہ ہے جو دیکھے بغیر نہیں کہا جاتا۔ اور اس سے اہم تر گواہوں کی تعداد ہے: انس کی روایت میں «تقریباً تین سو»، اور حدیبیہ کے دن جابر کی روایت میں چودہ سو۔ جس خبر کے اتنے گواہ ہوں، پھر وہ روایت اور مدون بھی ہو، اور ان میں سے ایک بھی اس کا انکار نہ کرے – وہ ان کے بعد گھڑی نہیں جا سکتی۔

جو کا ایک صاع جس نے ہزار کو سیر کیا

پھر میں وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا... تو آپ نے فرمایا: خندق والوں کو بلا لاؤ۔ اور وہ ایک ہزار تھے... اور انہوں نے اللہ کی قسم کھائی کہ لوگوں نے کھایا یہاں تک کہ اسے چھوڑ کر پلٹ گئے، اور ہماری ہانڈی ویسے ہی اُبل رہی تھی

بخاری اور مسلم نے روایت کیا – متفق علیہ



خندق کا دن – جب لوگ بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے

آسان لفظوں میں

جابر نے نبی کریم ﷺ کو تھوڑے سے کھانے پر بلایا جو چند افراد کو کافی تھا، تو آپ ﷺ نے خندق کھودنے والے ایک ہزار آدمیوں کو بلا لیا۔ سب نے کھایا یہاں تک کہ سیر ہو گئے، اور ہانڈی پھر بھی بھری ہوئی تھی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ محاصرے کے سخت ترین دنوں کی بات ہے۔ مسلمان بھوکے تھے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے خود بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا۔ اور کھانا جو کا ایک صاع اور ایک چھوٹی بکری تھی – صرف ایک گھر کے لیے کافی۔ اور جابر نے جو کیا تھا اس پر چپکے سے اپنی بیوی سے معذرت بھی کر لی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پوری حدیث صحیح بخاری میں ہے، جسے جابر بن عبد اللہ خود اپنی اور اپنے حال کی روداد کے طور پر باریک گھریلو تفصیلات کے ساتھ بیان کرتے ہیں: بیوی سے ان کی گفتگو، رسوائی کا خوف، نبی کریم ﷺ کا ہانڈی کو آگ سے نہ اتارنے کا حکم، اور یہ حکم کہ اس میں سے نکالا جائے مگر کھولا نہ جائے۔ اور آخر میں جابر قسم کھاتے ہیں: «انہوں نے اللہ کی قسم کھائی کہ لوگوں نے کھایا یہاں تک کہ اسے چھوڑ کر چلے گئے، اور ہماری ہانڈی ویسے ہی اُبل رہی تھی» – یعنی بھری ہوئی کھول رہی تھی۔

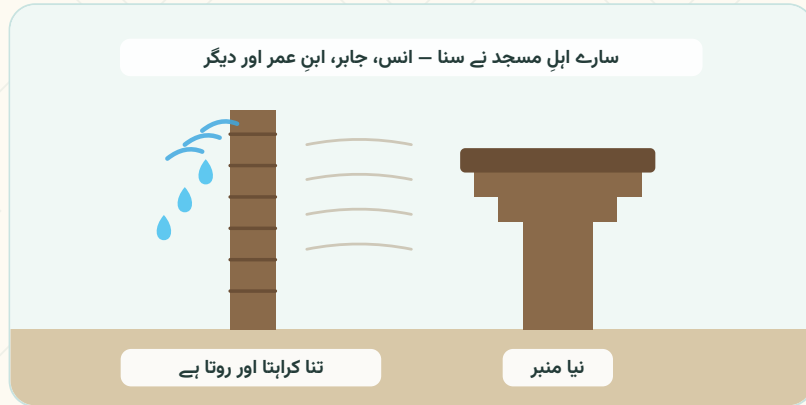
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایسا واقعہ گھڑا نہیں جا سکتا، کیونکہ یہ ہزار گواہوں کے سامنے ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں پیش آیا۔ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو لشکر میں سینکڑوں اسے جھٹلاتے، اور ان میں منافق بھی تھے جو تاک میں رہتے تھے۔ اس سے بھی باریک بات یہ ہے کہ راوی خود اپنی شرمندگی اور کھانے کی کمی کے خوف کا ذکر کرتا ہے – یہ وہ تفصیل نہیں جو کوئی گھڑنے والا اپنی بڑائی کے لیے شامل کرے۔ اور صحاح میں اس کی نظیریں بہت ہیں: تبوک کا کھانا، ابن جراح کی کھجوریں، اور جابر کے والد کا وہ قرض جو ان کھجوروں سے ادا ہوا جو اس کے دسویں حصے کو بھی کافی نہ تھیں۔

وہ تنا جوان کے لیے تڑپا

مسجد کھجور کے تنوں پر چھائی ہوئی تھی، اور نبی کریم ﷺ جب خطبہ دیتے تو ان میں سے ایک تنے کے پاس کھڑے ہوتے۔ پھر جب آپ کے لیے منبر بنایا گیا... تو ہم نے اس تنے سے ایسی آواز سنی جیسے حاملہ اونٹنی کی آواز، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور اس پر ہاتھ رکھا تو وہ خاموش ہو گیا

بخاری نے روایت کیا – صحیح



کھجور کا ایک تانا جو دسویں مہینے کی حاملہ اونٹنی کی طرح کراہا

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب آپ کے لیے منبر بنا دیا گیا تو وہ تانا رویا اور کراہا یہاں تک کہ مسجد میں موجود ہر شخص نے سنا – تو آپ ﷺ اترے اور اسے گلے لگایا، سو وہ چپ ہو گیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تنا ایک خشک لکڑی ہے جس میں کوئی حس نہیں۔ اور اس سے دسویں مہینے کی حاملہ اونٹنی جیسی سنائی دینے والی آواز نکلتا ایسی بات ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ اور اس دن مسجد جمعہ کے روز لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

حدیث صحیح بخاری اور دیگر کتب میں ہے، اور صحابہ کی ایک جماعت سے بہت سی سندوں سے مروی ہے: جابر بن عبد اللہ، انس بن مالک، عبد اللہ بن عمر، ابی بن کعب، سہل بن سعد، بریدہ اور دوسرے – یہاں تک کہ اہل علم نے اسے متواتر میں شمار کیا۔ حسن بصری نے اسے بیان کرتے ہوئے کہا: «اے مسلمانو! لکڑی رسول اللہ ﷺ کے شوق میں تڑپتی ہے، تو آپ لوگ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ ان کے مشتاق ہوں»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دلیل کا مقام یہ ہے کہ یہ مدینہ کی مسجد میں جمعہ کے دن پیش آیا، یعنی شہر کے سب سے بڑے ہفتہ وار اجتماع کے سامنے، نہ کسی تنہائی میں اور نہ چند افراد کے سامنے۔ اور صحابہ کی بڑی تعداد نے اسے روایت کیا، ہر ایک نے اپنے الفاظ میں، اور آواز کا نقشہ بھی ملتے جلتے لفظوں میں کھینچا – «حاملہ اونٹنی کی آواز جیسی»۔ اور آخری تفصیل وہ ہے جو اس خبر کو خیال سے بلند کر دیتی ہے: جب آپ نے اس پر ہاتھ رکھا تو وہ چپ ہو گیا، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: «اگر میں اسے گلے نہ لگاتا تو یہ قیامت تک تڑپتا رہتا»۔ جس خبر کو پوری مسجد دیکھے، پھر درجنوں صحابہ اسے روایت کریں، اور حاضرین میں سے کوئی ایک بھی اس کا انکار نہ کرے۔

بیت المقدس کا نقشہ، جسے کبھی دیکھا نہ تھا

پاک ہے وہ جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا،
جس کے گرداگرد ہم نے برکت رکھی ہے

سورہ اسراء — آیت 1



صبح قریش کو خبر دی، تو انہوں نے مسجد کا نقشہ دروازہ بہ دروازہ پوچھا

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ کو ایک ہی رات میں مکہ سے بیت المقدس لے جایا گیا۔ جب آپ نے قریش کو خبر دی تو انہوں نے جھٹلایا، اور آپ سے کہا **کہ مسجد کا نقشہ بیان کیجیے** — اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسے دیکھ چکے تھے۔ آپ نے ایسا بیان کیا کہ وہ بول اٹھے: «نقشہ تو اس نے ٹھیک بتایا»۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مکہ اور بیت المقدس کے درمیان تقریباً 1200 کلومیٹر ہیں، جو قافلہ ایک طرف کا ایک مہینے میں طے کرتا تھا۔ اور نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں بیت المقدس کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جبکہ مکہ میں بہت سے تاجر شام جا چکے تھے، مسجد دیکھ چکے تھے اور اس کے نشانات جانتے تھے۔ سو آزمائش سب سے خطرناک صورت میں تھی: ایسی جگہ کا نقشہ بیان کرنا جسے آپ کے مخالف جانتے ہوں اور آپ خود نہ جانتے ہوں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

واقعہ صحیحین اور دیگر کتب میں ہے۔ بخاری اور مسلم نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «جب قریش نے مجھے جھٹلایا تو میں حجر میں کھڑا ہو گیا، پھر اللہ نے بیت المقدس میرے سامنے کھول دیا، سو میں اس کی نشانیاں انہیں بتاتا جاتا تھا اور خود اسے دیکھ رہا تھا»۔ اور ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے اس کے دروازوں کی تعداد پوچھی تو آپ نے گن کر بتا دی۔ پھر آپ نے انہیں راستے میں ان کے اپنے قافلے کی خبر دی، اس کا نقشہ بیان کیا اور آنے کا وقت بھی بتایا — اور وہ ویسے ہی آیا جیسے آپ نے کہا تھا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ ایک فوری، براہ راست اور قابلِ تکذیب آزمائش تھی، ایک ہی مجلس میں۔ آپ سے کسی ایسی غائب چیز کا نقشہ نہیں مانگا گیا جسے جانا ہی نہ جا سکے، بلکہ ایسی جگہ کا جسے پوچھنے والے جانتے تھے اور آپ نہیں جانتے تھے۔ اور ایک ہی تفصیل میں ایک غلطی اسی دن پوری دعوت گرا دینے کو کافی تھی۔ انہوں نے نقشے کی درستی کا اقرار کیا، پھر منہ پھیر لیا — جیسا کہ ہر نشانی کے ساتھ ان کی عادت تھی۔ رہا سب سے قوی گواہ، تو وہ قافلے کی خبر ہے: آپ نے انہیں ان کے اپنے قافلے کی خبر دی کہ وہ کہاں ہے اور کب پہنچے گا، سو انہوں نے انتظار کیا اور اسے ٹھیک ویسا ہی پایا، اسی دن جو آپ نے کہا تھا۔ ایک مستقل گواہی جو خود انہی کے اپنے ہاتھوں پوری ہوئی، آپ کے ہاتھوں نہیں۔

جنگ سے پہلے مقتولوں کے گرنے کی جگہیں

رسول اللہ ﷺ ایک دن پہلے ہمیں اہل بدر کے گرنے کی جگہیں دکھا رہے تھے، فرماتے تھے: یہ کل فلاں کے گرنے کی جگہ ہے، ان شاء اللہ۔ کہا: پھر ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ رکھنے کی جگہ سے نہ ہٹا

مسلم نے روایت کیا - صحیح

معرکے سے ایک دن پہلے ہاتھ سے جگہیں متعین کیں

«کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ رکھنے کی جگہ سے نہ ہٹا»



ریت میں بنائے ہوئے نشان... اور لاشیں انہی پر ملیں

آسان لفظوں میں

بدر کی لڑائی سے ایک دن پہلے نبی کریم ﷺ میدان جنگ میں چلے اور اپنے ہاتھ سے زمین پر جگہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے رہے: **یہاں فلاں مارا جائے گا، اور یہاں فلاں۔** پھر جب لڑائی ہوئی تو ان میں سے کوئی اس جگہ سے آگے نہ گرا جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا تھا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بدر پہلا بڑا معرکہ تھی: مسلمان تین سو کچھ اوپر تھے اور مشرک تقریباً ایک ہزار۔ اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جیتے گا کون، چہ جائیکہ مقتولوں کے نام اور ان کی جگہیں متعین کرے۔ اور لڑائی میں لوگ ہٹتے بڑھتے ہیں، حملہ کرتے ہیں اور بھاگتے ہیں؛ سو اس زمین کے ٹکڑے کو متعین کرنا جس پر ہر آدمی گرے گا ایسی بات ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

حدیث صحیح مسلم میں انس بن مالک اور عمر بن الخطاب سے مروی ہے۔ انس کی روایت میں ہے: «آپ فرمانے لگے: یہ کل فلاں کے گرنے کی جگہ ہے - اور زمین پر یہاں اور یہاں ہاتھ رکھتے جاتے تھے۔ کہا: پھر ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ رکھنے کی جگہ سے نہ ہٹا»۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ لڑائی کے بعد آپ کنوئیں پر کھڑے ہو کر انہیں نام لے کر پکار رہے تھے: «اے فلاں بن فلاں، اے فلاں بن فلاں، کیا تم نے وہ سچ پا لیا جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا؟»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

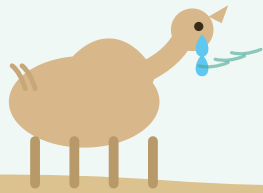
یہاں پیشین گوئی وقوع سے پہلے خود زمین پر درج کر دی گئی، اور پورا لشکر اسے دیکھ رہا تھا۔ اور یہ ان خبروں میں سے ہے جنہیں جھٹلانا سب سے آسان تھا: صرف ایک آدمی کا اپنی جگہ کے سوا کہیں اور گر جانا کافی تھا کہ تین سو گواہوں کے سامنے سارا معاملہ باطل ہو جاتا۔ اور اس نے تین چیزیں یکجا کر دیں: افراد کو نام لے کر متعین کرنا، ان کے قتل ہو جانے کا جزم یعنی کم تعداد والے گروہ کی فتح کا جزم، اور ان کے گرنے کی جگہ کو بالشت بھر تک متعین کرنا۔ ایک ہی خبر میں تین قیدیوں، جو اگلے دن دونوں لشکروں کی آنکھوں کے سامنے پوری ہوئیں۔

وہ اونٹ جو رویا اور جس نے شکایت کی

نبی ﷺ کو دیکھ کر وہ بلبلایا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ نبی ﷺ اُس کے پاس آئے اور اُس کے کان کے پیچھے ہاتھ پھیرا تو وہ خاموش ہو گیا۔ پھر فرمایا: اِس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ... پھر فرمایا: کیا تم اِس جانور کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے جس کا اللہ نے تمہیں مالک بنایا ہے؟ اِس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اِسے بھوکا رکھتے ہو اور تھکاتے ہو

روایت ابوداؤد - البانی نے صحیح قرار دیا

جانور شکایت کرتا ہے... شکایت تفصیل سمیت نقل ہوئی



اپنے مالک کو وہ بتایا جو اسی کو معلوم تھا: بھوکا اور تھکا رکھتا ہے

اونٹ چل کر آپ ﷺ کے پاس آیا اور اُس کی آنکھیں بہہ پڑیں - صحابہ کے سامنے

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ ایک انصاری کے باغ میں داخل ہوئے تو ایک اونٹ آپ کے پاس آیا جو **رو رہا تھا**۔ آپ ﷺ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پُرسکون ہو گیا۔ پھر اُس کے مالک کو بلا کر فرمایا: **«اِس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اِسے بھوکا رکھتے ہو اور تھکاتے ہو»**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جانور شکایت نہیں کرتا اور نہ اُس کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اور آدمی کا اپنے اونٹ کے ساتھ برتاؤ اُن دونوں کے بیچ کا نجی معاملہ ہے؛ کوئی نہیں جانتا کہ تنہائی میں وہ اُس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ چنانچہ اِس خبر میں دو باتیں ایک ساتھ ہیں: **جانور کی شکایت کو سمجھنا**، اور **اُس راز کی خبر پانا جسے اُس کے مالک کے سوا کوئی نہیں جانتا**۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ حدیث سنن ابوداؤد اور مسند احمد میں عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اور البانی وغیرہ نے اِسے صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح کتابوں میں اِس کی ثابت نظیریں بھی ہیں: **خیبر کی زہر آلود بکری کی حدیث**، جس میں دستی نے آپ ﷺ کو خبر دی کہ وہ زہر آلود ہے، تو آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور صحابہ کو بھی ہاتھ روکنے کا حکم دیا (ابوداؤد اور دارمی، اور اصل واقعہ صحیحین میں ہے)، اور **اُس بھیڑیے کی حدیث جس نے چرواہے سے بات کی** اور اُسے نبی ﷺ کی بعثت کی خبر دی (روایت احمد، اور اِسے صحیح قرار دیا گیا)۔ عرب اِس قسم کی کوئی چیز نہیں جانتے تھے، بلکہ انہوں نے اِسے بہت بڑی بات سمجھا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

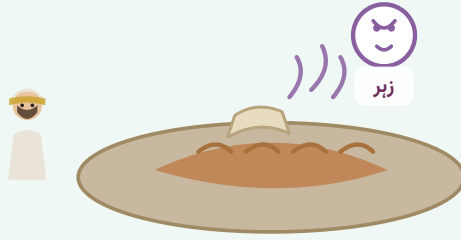
اِس واقعے کو فیصلہ کن بنانے والی چیز اُس کا عملی اثر ہے۔ نبی ﷺ نشانی دکھا کر رُک نہیں گئے، بلکہ اُسے **جانوروں پر رحم کا ایک قانون** بنا دیا: «کیا تم اِس جانور کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے جس کا اللہ نے تمہیں مالک بنایا ہے؟»۔ اور یہ آپ ﷺ کی سنت کے ایک پورے باب سے ہم آہنگ ہے: جانور کو اذیت دینے اور اُسے نشانہ بنانے کی ممانعت، اُس عورت کی حدیث جو ایک بلی کو باندھ رکھنے پر آگ میں گئی، اور اُس شخص کی جسے ایک کتے کو پانی پلانے پر بخش دیا گیا۔ اور یہ سب ساتویں صدی عیسوی میں، ایسے ماحول میں جو جانوروں کو حقیر سمجھتا تھا - اور دنیا کی پہلی انجمنِ رحمِ حیوانات سے ہزار برس سے بھی پہلے - ایک اور نشانی ہے۔

زهر آلود بکری نے آپ کو خبر دی

خیبر میں ایک یہودی عورت نے آپ ﷺ کو بھنی ہوئی بکری ہدیہ کی جس میں زهر ملا رکھا تھا... آپ نے ایک لقمہ لیا مگر نگلا نہیں اور فرمایا: یہ ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ یہ زهر آلود ہے

روایت ابوداؤد و دارمی — سند حسن ہے، اور اصل واقعہ صحیحین میں ہے

فتح خیبر کے بعد ہدیے کے کھانے میں ملا زہر



رک گئے اور ساتھیوں کو خبردار کیا — سب بچ گئے، سوائے اُس کے جو لقمہ نگل چکا

ایک عورت نے آزمانا چاہا: نبی ہے تو اسے بتا دیا جائے گا، بادشاہ ہے تو ہمیں اس سے نجات مل جائے گی

آسان لفظوں میں

ایک یہودی عورت نے نبی ﷺ کو بھنی ہوئی بکری ہدیہ کی جس میں اُس نے زہر ڈال رکھا تھا۔ آپ نے جب ایک لقمہ لیا تو اُسے **نگلا نہیں**، اور فرمایا: «یہ دستی مجھے بتا رہی ہے کہ یہ زہر آلود ہے»۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ فتح خیبر کے بعد کا واقعہ ہے، اور دشمنی کھلی ہوئی تھی۔ زہر بھنے ہوئے گوشت میں مل جائے تو نہ آنکھ سے پہچانا جاتا ہے نہ بو سے۔ اور خود اُس عورت نے پوچھے جانے پر کہا: میں جاننا چاہتی تھی — «اگر یہ نبی ہے تو اسے بتا دیا جائے گا، اور اگر بادشاہ ہے تو ہمیں اس سے نجات مل جائے گی»۔ یعنی اُس نے معاملہ ہی فیصلہ کن آزمائش بنا کر ترتیب دیا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ واقعہ **صحیح بخاری اور صحیح مسلم** اور سنن ابوداؤد و دارمی میں انس، ابوہریرہ، جابر، ابن عباس اور دوسروں سے مروی ہے۔ اسی کے اندر خود اُس عورت کا اعتراف اور اس کام سے اُس کا مقصد بھی نقل ہوا ہے۔ اور بشر بن براء رضی اللہ عنہ اس لیے فوت ہو گئے کہ انہوں نے تنبیہ سے پہلے اپنا لقمہ نگل لیا تھا — یہ وہ تفصیل ہے جو کوئی گھڑنے والا خبر میں نہ بڑھاتا، کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نشانی نے ہر نقصان کو نہیں روکا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

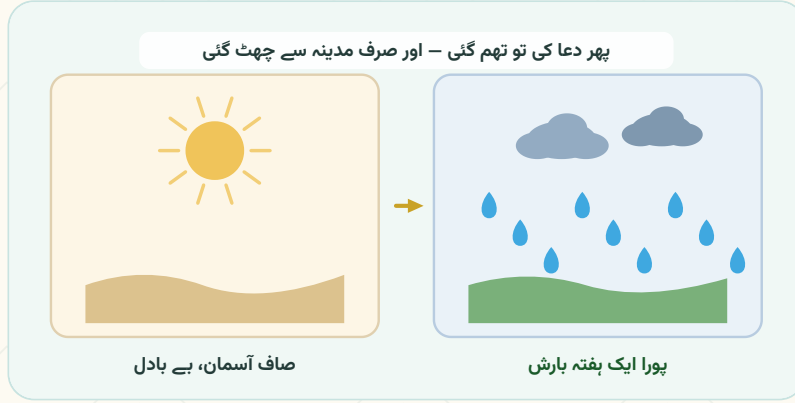
اس واقعے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ **آزمائش خود دشمن نے ترتیب دی** اور اپنی شرط پہلے سے بیان کر دی: نبوت کی پہچان یہ ہو گی کہ اُسے زہر کی خبر دے دی جائے۔ پھر شرط ٹھیک اُسی طرح پوری ہوئی، اور اُس نے لوگوں کے سامنے خود اس کا اعتراف کیا۔ پھر دلیل اور بڑھ گئی: **نبی ﷺ نے اُسے معاف کر دیا** — مشہور ترین روایات میں — اور یہ اُس شخص کا طرز عمل ہے جو مطمئن ہو، نہ کہ خوف زدہ انتقام لینے والے کا۔ اور نقل کی سچائی کو حتمی کرنے والی آخری تفصیل **ایک صحابی کی زہر سے موت کا ذکر ہے**؛ روایت نے واقعے کو سنوارا نہیں اور نہ اُسے مکمل فتح بنا کر پیش کیا، بلکہ اُس کی تلخی اور شیرینی دونوں نقل کر دیں۔

بارش جو مانگنے پر برسی اور مانگنے پر تھم گئی

آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا: اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما... اللہ کی قسم، ہمیں آسمان میں کوئی بادل نظر نہ آتا تھا... ابھی ہاتھ نیچے نہ کیا تھا کہ پہاڑوں جیسے بادل اُمنڈ آئے، اور ابھی اترے نہ تھے کہ بارش آپ کی ڈاڑھی پر

بہہ رہی تھی

روایت بخاری و مسلم – متفق علیہ



آسان لفظوں میں

جمعہ کے خطبے میں ایک شخص نے قحط کی شکایت کی، تو نبی ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی - جبکہ آسمان صاف تھا اور اُس میں کوئی بادل نہ تھا۔ ابھی ہاتھ نیچے نہیں کیا تھا کہ بادل اُمنڈ آئے، اور پورا ہفتہ بارش ہوتی رہی یہاں تک کہ لوگوں نے بارش کی زیادتی کی شکایت کی، تو آپ نے دعا کی اور وہ تھم گئی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بارش کی دعا قوموں میں ایک پرانا دستور ہے، لیکن وہ ایک دعا ہے جس کی اُمید کی جاتی ہے، نہ کہ وعدہ جو پورا ہو کر رہے۔ اور بارش صاف آسمان سے لمحوں میں نہیں برستی۔ اور یہ کہ ایسا دو بار، دو متضاد سمتوں میں ہو - مانگنے پر برسنا اور پھر مانگنے پر تھم جانا - اتفاق کے ہر امکان سے باہر ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ حدیث صحیحین میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انس نے منظر کو قابل ذکر باریکی سے بیان کیا: آسمان بالکل صاف تھا، بادل «پہاڑوں کی مانند» اُمنڈے، اور بارش اگلے جمعہ تک جاری رہی۔ پھر جب آپ ﷺ نے بارش تھمنے کی دعا کی تو انس کہتے ہیں: «وہ تھم گئی اور ہم نکلے تو دھوپ میں چل رہے تھے»، اور ایک روایت میں: «مدینے سے یوں چھٹ گئی جیسے کپڑا پھٹ جائے» - یعنی بارش صرف مدینے سے ہٹ گئی اور اُس کے چاروں طرف برستی رہی۔

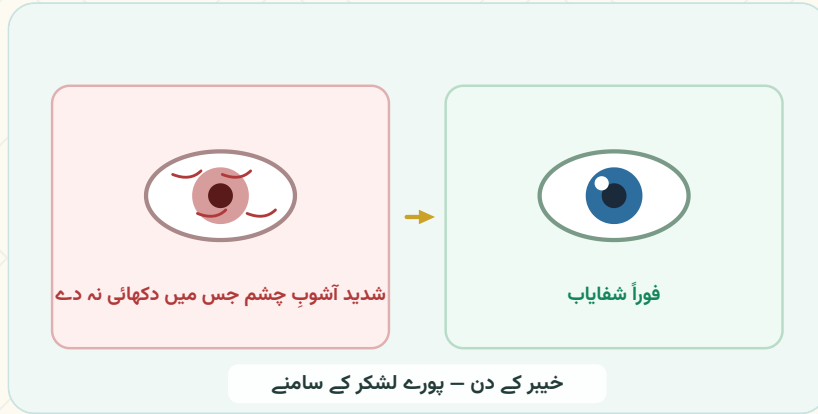
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہی آخری تفصیل اس خبر کی سب سے مضبوط چیز ہے۔ دعا کے بعد بارش برسنے کے بارے میں شاید کہا جا سکے کہ وہ اپنے موسم کے موافق آ گئی۔ لیکن صرف مدینے سے اُس کا ہٹ جانا اور چاروں طرف برستی رہنا ایسا واقعہ ہے جسے اتفاق سے نہیں سمجھایا جا سکتا، اور اہل مدینہ سب نے ایک ہی دن اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا۔ اور دوسری دعا کے الفاظ دیکھیے، وہ انتہائی باریک ہیں: «اے اللہ! ہمارے اردگرد، ہم پر نہیں» - آپ ﷺ نے بارش کا سرے سے اٹھ جانا نہیں مانگا، بلکہ یہ مانگا کہ اُسے مدینے سے ہٹا کر اُس کے اردگرد کر دیا جائے، کیونکہ لوگوں کو اُس کی ضرورت تھی۔ اور یہ ٹھیک اُسی باریک صورت میں واقع ہوا جس میں دعا کی گئی تھی۔

علی کی آنکھ... اور قتادہ کی آنکھ

آپ ﷺ نے اُن کی آنکھوں میں لعابِ دھن لگایا اور دعا کی، تو ایسے تندرست ہوئے گویا کوئی تکلیف ہی نہ تھی

روایت بخاری و مسلم – متفق علیہ



علی کی آنکھیں اتنی ڈکھتی تھیں کہ دیکھ نہ پاتے تھے، اور لمحوں بعد جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا

آسان لفظوں میں

خیبر کے دن نبی ﷺ نے فرمایا: **کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔** پھر آپ نے علی کو بلایا – اُن کی آنکھیں بیمار تھیں اور وہ دیکھ نہ سکتے تھے – آپ نے اُن کی آنکھوں میں لعابِ دھن لگایا تو وہ اُسی وقت **تندرست ہو گئے**، پھر خیبر اُنہی کے ہاتھوں فتح ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

آشوبِ چشم اُس ماحول کی ایک معروف بیماری تھی، اور صبر اور دنوں کے گزرنے کے سوا اُس کا کوئی علاج نہ تھا۔ اور وہ لمحوں میں ٹھیک نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ ایک نازک جنگی موقع پر پیش آیا، اور لشکر منتظر اور بے تاب تھا کہ جھنڈا کس کے ہاتھ آتا ہے – عمر نے کہا: «مجھے کبھی امارت کی خواہش نہیں ہوئی سوائے اُس دن کے»۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ حدیث **صحیحین** میں سہل بن سعد، ابوبریرہ اور سلمہ بن اکوع سے مروی ہے۔ اور اسی کی نظیر **قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ** کی آنکھ کا وہ واقعہ ہے جو اُحد کے دن ثابت ہے – اُن کی آنکھ ایسی زخمی ہوئی کہ رخسار پر آ پڑی، تو نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اُسے واپس رکھ دیا اور اُن کے لیے دعا کی، اور وہی اُن کی دونوں آنکھوں میں زیادہ خوبصورت اور زیادہ تیز نظر والی ہو گئی۔ اور یہ بات اُن کی اولاد میں معروف رہی، یہاں تک کہ اُن کے پوتے نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے سامنے اِس کا ذکر کیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دو چیزیں اِس واقعے کو محض دعوے کے دائرے سے نکال دیتی ہیں۔ پہلی: یہ **ایک پورے لشکر کے سامنے، صف بندی کے وقت** پیش آیا، اور سب نگاہیں جھنڈا اٹھانے والے پر تھیں۔ دوسری – اور یہ زیادہ اہم ہے – یہ کہ شفا بذاتِ خود مقصود نہ تھی، بلکہ **ایک ذمہ داری نبھانے کی شرط** تھی: جھنڈا فوراً اُن کے حوالے کیا گیا اور وہ لڑنے نکلے، اور اُسی دن قلعہ اُنہی کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اگر وہ حقیقتاً تندرست نہ ہوئے ہوتے تو اُسی گھڑی بات کھل جاتی۔ رہی قتادہ کی آنکھ، تو اُس کا نشان **دہائیوں تک دیکھا جاتا رہا** – ایسی نشانی جو لوگ عمر بھر اُس شخص کے چہرے پر دیکھتے رہے، نہ کہ محض ایک نقل کی جانے والی خبر۔

سراقہ اور وہ گھوڑی جو زمین میں دھنس گئی

میں اپنی گھوڑی پر جا رہا تھا ... کہ وہ ٹھوکر کھا گئی اور میں گر پڑا ... پھر میں اپنی گھوڑی پر سوار ہوا، اور جب وہ دونوں مجھے نظر آئے تو اُس کے اگلے پاؤں زمین میں گھٹنوں تک دھنس گئے

روایت بخاری - صحیح



ایک تعاقب کرنے والا جو سو اونٹنیوں کے لالچ میں نکلا... اور امان مانگتا ہوا لوٹا

آسان لفظوں میں

سراقہ ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ اور ابوبکر کے تعاقب میں نکلا۔ جب بھی وہ اُن کے قریب پہنچتا، اُس کی گھوڑی کے پاؤں سخت زمین میں دھنس جاتے یہاں تک کہ گھٹنوں تک پہنچ جاتے۔ اُس نے جان لیا کہ اُسے روک دیا گیا ہے، تو اُس نے اُن سے امان مانگی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قریش نے سو اونٹنیاں اُس کے لیے مقرر کر رکھی تھیں جو محمد ﷺ کو زندہ یا مردہ لے آئے۔ اور سراقہ بنی مُدَلج کا ماہر اور تجربہ کار شہسوار تھا، جو کھوج لگانے اور نقش قدم پہچاننے میں مشہور تھے۔ منظر ایک کھلے صحرا کا تھا جہاں بھاگنے کی کوئی جگہ نہ تھی، اور وہ دونوں کسی حفاظت کے بغیر تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ قصہ اپنی تفصیلات کے ساتھ صحیح بخاری میں ہے، ہجرت کی طویل حدیث کے اندر عائشہ اور ابوبکر سے، اور خود سراقہ اُسے روایت کرتا ہے اپنے اسلام لانے کے بعد۔ اُس نے بتایا کہ گھوڑی اُس کے ساتھ بار بار دھنسی، اور اُس نے تیروں سے فال نکالی تو وہی نکلا جو اُسے ناپسند تھا، مگر اُس نے اُسے نہ مانا؛ پھر جب مایوس ہوا تو امان کی آواز دی اور اُن دونوں کو زاہد راہ اور سامان پیش کیا۔ نبی ﷺ نے اُسے امان کی تحریر لکھ دی، جسے وہ فتح مکہ کے دن لے کر آیا۔ اور اُسی لمحے آپ ﷺ نے اُس سے فرمایا: «اُس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تم کسریٰ کے دونوں کنگن پہنو گے؟» - اور بعد میں اُس نے وہ پہنے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس خبر کی سب سے مضبوط بات یہ ہے کہ اِس کا راوی خود دشمن ہے۔ سراقہ واقعے کے دن مسلمان نہ تھا، بلکہ انعام کا لالچ تعاقب کرنے والا تھا۔ برسوں بعد وہ مسلمان ہوا اور لوگوں کو بتایا کہ اُس کے ساتھ کیا گزرا۔ اور دشمن کا اپنی ناکامی اور جو کچھ اُس نے دیکھا اُس پر اپنے خلاف گواہی دینا، اہل نقل کے نزدیک ثبوت کے سب سے بلند درجوں میں سے ہے۔ اور وہ عجیب تفصیل دیکھیے جو گھڑی نہیں جاتی: گھوڑی ایک بار نہیں، کئی بار دھنسی، اور وہ ہر بار پھر تعاقب کی طرف لوٹتا رہا، یہاں تک کہ آخر کار مایوس ہو گیا۔ اور کوئی تعاقب کرنے والا اگر قصہ گھڑے تو اُسے قتل کی کوشش پر اِس بار بار کے اصرار کے ساتھ نقل نہیں کرے گا۔

سلمان فارسی اور وہ تین نشانیاں

اور اُس نے مجھے اُن کی نشانیاں بتائیں: وہ صدقہ نہیں کھاتے، ہدیہ قبول کرتے ہیں، اور اُن کے دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت ہے

روایت احمد و ابن حبان — سند حسن ہے

تین نشانیاں جو اُس نے خود آزمائیں

- ✓ اُس نے صدقہ پیش کیا... تو نہ کھایا
- ✓ اُس نے ہدیہ پیش کیا... تو ساتھ کھایا
- ✓ اُس نے پیٹھ دیکھی تو مہرِ نبوت پائی

اسی مجلس میں اسلام لایا

ایک شخص جس نے ان تین نشانوں کی تلاش میں فارس و شام چھان مارا

وہ نشانیاں جو بعثت سے پہلے ایک عیسائی راہب سے سنیں... اور پھر پا لیں

آسان لفظوں میں

سلمان فارسی نے اپنی قوم کا دین چھوڑا اور حق کی تلاش میں شہر شہر پھرے، یہاں تک کہ ایک راہب نے انہیں آنے والے نبی کی تین نشانیاں بتائیں۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو **تینوں نشانیاں خود آزمائیں اور پا لیں** — چنانچہ مسلمان ہو گئے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

شام اور دوسرے علاقوں کے اہل کتاب ایک ایسے نبی کے منتظر تھے جو سرزمینِ عرب میں مبعوث ہونے والے تھے، اور وہ اُن کی نشانیاں نسل در نسل محفوظ رکھتے تھے۔ سلمان سرزمینِ فارس سے نکلے اور برسوں راہبوں کے درمیان پھرتے رہے، یہاں تک کہ غلام بنا کر بیچ دیے گئے اور مدینہ پہنچے — ہجرت سے کئی برس پہلے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ قصہ خود سلمان مسند احمد، صحیح ابن حبان اور سیرت ابن اسحاق میں بیان کرتے ہیں۔ اس میں ہے کہ وہ کچھ کھجوریں لائے اور کہا: یہ صدقہ ہے۔ نبی ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: «کھاؤ» اور خود نہ کھایا۔ پھر وہ دوسری کھجوریں لائے اور کہا: یہ ہدیہ ہے۔ تو آپ نے اُن کے ساتھ کھایا۔ پھر سلمان دیکھنے کے لیے آپ کی پیٹھ کے پیچھے گھومے، اور نبی ﷺ سمجھ گئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، تو آپ نے اپنی چادر پیٹھ سے ہٹا دی، اور انہوں نے مہر دیکھ لی، تو اُس پر جھک کر اُسے چومنے اور رونے لگے۔

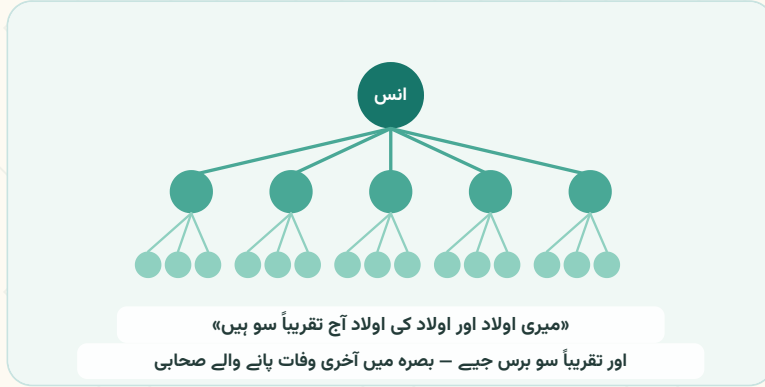
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ کوئی کائناتی معجزہ نہیں، بلکہ لفظ کے پورے معنوں میں **ایک منظم علمی آزمائش** ہے: پہلے سے متعین مفروضے، ہر ایک کے لیے ایک تجربہ، اور ایک نتیجہ جو قبول یا رد کیا جائے۔ سلمان کسی منطق یا جذبے کی بنا پر مسلمان نہیں ہوئے، بلکہ اُس وقت جب **تینوں شرطیں پوری ہو گئیں**۔ اور ان میں سب سے باریک دوسری نشانی ہے: **صدقے اور ہدیے کے درمیان فرق** — اور یہ نبی ﷺ کے ساتھ خاص ایک شرعی حکم ہے (صدقہ آپ پر حرام ہے اور ہدیہ حلال)، جس تک کوئی اندازے سے نہیں پہنچ سکتا۔ کئی روایتوں میں آیا ہے کہ راہب، یہودی علما اور حنفا بعثت سے پہلے ایک منتظرِ نبی کی بات کرتے اور اُن کی نشانیاں بیان کرتے تھے — اُن میں بحیرا راہب، اور زید بن عمرو بن نفیل جو بعثت سے پہلے دینِ ابراہیم کی تلاش میں فوت ہوئے۔ پھر یہود کے عالم عبداللہ بن سلام نے مدینہ آمد کے پہلے ہی دن آپ کو پہچان لیا اور اسلام قبول کر لیا۔

انس کے لیے دعا کی... اور وہ انصار میں سب سے زیادہ مال دار ہو گئے

اے اللہ! اس کا مال اور اولاد بڑھا دے اور جو کچھ تو نے اسے دیا ہے اُس میں برکت عطا فرما۔ انس کہتے ہیں: اللہ کی قسم، میرا مال بہت ہے، اور میری اولاد اور اولاد کی اولاد آج تقریباً سو کی گنتی میں ہے

روایت بخاری و مسلم — متفق علیہ



ایک تنگدست گھر میں کی گئی دعا... جس کے صاحب نے عمر بھر اُس کا پورا ہونا خود دیکھا

آسان لفظوں میں

اُمّ سلیم نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ اپنے بیٹے انس کے لیے دعا فرمائیں، تو آپ نے اُن کے لیے **مال کی کثرت، اولاد کی کثرت اور برکت کی دعا** کی۔ اور انس اتنا جیے کہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں کو بتایا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

انس اُس دن دس برس کے چھوٹے لڑکے تھے، اور اُنہوں نے دس برس نبی ﷺ کی خدمت کی۔ اور اُن کا گھرانہ نہ انصار میں سب سے مالدار تھا اور نہ سب سے بڑی تعداد والا۔ اور اُس دعا میں **تین متعین چیزیں** تھیں جو ایک عمر کے بعد ناپی جا سکتی ہیں: مال، اولاد، اور دونوں میں برکت۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ حدیث **صحیحین** میں ہے۔ اور خود انس ہی دہائیوں بعد اُس کے پورا ہونے کی خبر دیتے ہیں، اللہ کی قسم کھا کر: «میرا مال بہت ہے، اور میری اولاد اور اولاد کی اولاد آج تقریباً سو کی گنتی میں ہے»۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حجاج کے بصرہ آنے سے پہلے اُن کی اولاد میں سے تقریباً ایک سو بیس دفن ہو چکے تھے۔ اور اُن کا باغ سال میں دو بار پھل دیتا تھا۔ اور وہ تقریباً سو برس جیے، اور **بصرہ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی** تھے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

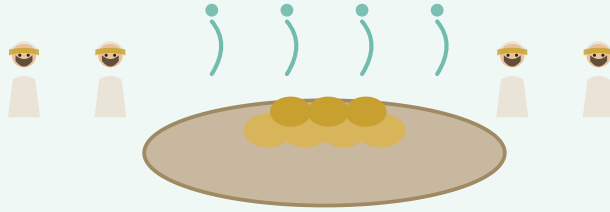
یہ ایک مختلف قسم کی دلیل ہے: **ایک پیش گوئی جس کا پورا ہونا خود اُس کا صاحب دیکھتا اور بیان کرتا ہے**۔ راوی ہی فائدہ اٹھانے والا ہے اور وہی گواہ، اور وہ اسے بصرہ میں بیان کرتا ہے جہاں اُس کے گرد ہزاروں لوگ ہیں جو اُس کا حال جانتے ہیں اور اُس کی اولاد، اُس کے پوتوں اور اُس کے مال کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ مبالغہ کرتا تو اُس کے اپنے شہر والے اُسے جھٹلا دیتے۔ اور اس کی نظیریں بہت اور ثابت ہیں: ابن عباس کے لیے فقہ اور قرآن کی تفسیر کی دعا، تو وہ «اُمّت کے عالم» بن گئے؛ سعد بن ابی وقاص کے لیے دعا کی قبولیت کی دعا، تو اُن کی دعا مستجاب ہوتی تھی اور لوگ اُن کی بددعا سے ڈرتے تھے؛ اور اُس شخص کے خلاف بددعا جس نے تکبر سے بائیں ہاتھ سے کھایا، تو وہ پھر کبھی اُسے اپنے منہ تک نہ اٹھا سکا۔ الگ الگ لوگوں کے بارے میں الگ الگ خبریں، جن میں سے ہر ایک کو تنہا جھٹلایا جا سکتا تھا۔

آپ کے سامنے کھانے کی تسبیح

ہم کھانے کی تسبیح سنتے تھے جب وہ کھایا جا رہا ہوتا تھا

روایت بخاری - صحیح

کھاتے وقت کھانے سے سنائی دینے والی آواز



سب حاضرین نے سنا - راوی ابن مسعود رضی اللہ عنہ

وہ ان نشانیوں کو برکت شمار کرتے تھے، خوف کی چیز نہیں

آسان لفظوں میں

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: «ہم کھانے کی تسبیح سنتے تھے جب وہ کھایا جا رہا ہوتا تھا» - یعنی وہ نبی ﷺ کے سامنے کھانے سے تسبیح کی آواز نکلتی ہوئی سنتے تھے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بے جان چیز کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اور کھانا خاموشی سے کھایا جاتا ہے۔ اور اُس سے تسبیح سنائی دینا ایسی بات ہے جس کی کسی کے تجربے میں کوئی مثال نہیں۔ اور نبی ﷺ کے سوا کسی سے ایسی کوئی بات نقل نہیں ہوئی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ روایت صحیح بخاری میں «اسلام میں نبوت کی نشانیوں کے باب» میں ہے۔ اور عبداللہ بن مسعود اسے جمع کے صیغے سے بیان کرتے ہیں: «ہم سنتے تھے» - یعنی یہ ایک اجتماعی اور بار بار کا مشاہدہ تھا، کوئی اکیلا واقعہ نہیں۔ اور اسی کی نظیر آپ کی ہتھیلی میں کنکریوں کی تسبیح کا ثابت شدہ واقعہ ہے، اور مکہ میں اُس پتھر کا آپ کو سلام کرنا، جیسا کہ صحیح مسلم میں جابر بن سمرہ سے مروی ہے: «میں مکہ کے ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا، میں اب بھی اُسے پہچانتا ہوں»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قوت اسی جمع اور تسلسل کے صیغے میں ہے: «ہم سنتے تھے»۔ اگر یہ ایک ہی بار ہوتا تو کہا جاتا «ہم نے سنا»۔ لیکن «سنتے تھے» تکرار اور عادت کا فائدہ دیتا ہے - یعنی یہ اُن کے ہاں ایک مانوس بات تھی جسے پوری جماعت جانتی تھی۔ اور ایسی بات ایسے ماحول میں نہیں گھڑی جاتی جہاں سیکڑوں زندہ گواہ موجود ہوں۔ اور قرآن اس پورے باب کا عام اصول یوں بیان کرتا ہے: «اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اُس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے» - تو تسبیح ہر چیز میں جاری ہے، اور نبی ﷺ کی موجودگی میں جو ہوا وہ اُس کے سننے پر سے پردہ اٹھ جاتا تھا، نہ کہ کسی نئی چیز کا پیدا ہونا۔

اب ہم اُن پر چڑھائی کریں گے... وہ ہم پر نہیں

❖ اللہ کی قسم، وہ آپ تک نہ پہنچیں گے جب تک میں آپ سے پہلے مر نہ جاؤں... اور آپ ﷺ نے خندق کے دن فرمایا: اب ہم اُن پر چڑھائی کریں گے، وہ ہم پر نہیں؛ ہم اُن کی طرف جائیں گے

روایت بخاری – صحیح

محاصرے کے سخت ترین لمحے میں حکمتِ عملی کی پیش گوئی

خندق 5 ہجری

حدیبیہ 6 ہجری

خیبر 7 ہجری

فتح مکہ 8 ہ

جو کہا گیا سب ہوا «میں ضرور جھنڈا دوں گا» ضررِ امن کے ساتھ داخل ہو گئے» اُن پر چڑھیں گے»

خندق کے بعد قریش نے مدینہ پر ایک بار بھی چڑھائی نہ کی

پہل کاری کا مکمل اُلٹ جانا... جس کا اعلان وقوع سے پہلے کر دیا گیا

آسان لفظوں میں

جب احزاب کے لشکر مدینے سے واپس چلے گئے تو نبی ﷺ نے فرمایا: «اب ہم اُن پر چڑھائی کریں گے اور وہ ہم پر چڑھائی نہیں کریں گے، ہم اُن کی طرف جائیں گے»۔ اور اُس دن کے بعد قریش نے مدینے پر کبھی چڑھائی نہ کی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

خندق کا محاصرہ مسلمانوں پر گزرنے والی سخت ترین چیز تھا۔ دس ہزار جنگجو مدینے کے گرد، بنی قریظہ کے یہود نے اندر سے عہد توڑ دیا، اور بھوک، سردی اور خوف۔ قرآن کہتا ہے: «اور دل گلوں تک آپہنچے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے»۔ اور ٹھیک اُسی لمحے پہل کاری کے اُلٹ جانے کا اعلان ہوتا ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اور یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے۔ اور حرف بہ حرف ویسا ہی ہوا جیسا آپ نے فرمایا: خندق (5 ہجری) کے بعد قریش کبھی مدینے پر حملے کے لیے نہ نکلے۔ بلکہ مسلمان ہی پہل کرنے والے بن گئے: 6 ہجری میں حدیبیہ، پھر 7 ہجری میں خیبر، پھر 8 ہجری میں فتح مکہ، پھر حنین اور تبوک۔ اور یہ ایک ایسی جنگی حقیقت ہے جس پر سیرت اور تاریخ کی تمام کتابیں متفق ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ ایک حکمتِ عملی کی خبر ہے، روحانی نہیں، اور یہی چیز اسے خالص تاریخی جانچ کے قابل بناتی ہے۔ اور یہ ممکنہ بدترین لمحے میں کہی گئی – یعنی جب تمام قرائن اس کے اُلٹ کہہ رہے تھے۔ معروف قاعدہ یہ ہے کہ جو کسی دم گھونٹ دینے والے محاصرے سے بچ نکلے، وہ اپنی حالت سنبھالنے میں لگ جاتا ہے، حملے میں نہیں۔ اور حدیث کے الفاظ دیکھیے: آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ «ہم فتح پائیں گے» – یہ تو عام بات ہے جس میں ہر چیز کی گنجائش ہے – بلکہ پہل کاری کی باگ ڈور کے منتقل ہونے کو متعین کیا: «ہم اُن کی طرف جائیں گے»۔ اور یہ اُس کی باریک تصویر ہے جو اگلے تین برسوں میں واقعاً ہوا: اُس کے بعد کی تمام مہمات مدینے سے باہر جاتی تھیں، اُس کی طرف آتی نہیں تھیں۔

ان خبروں پر بھروسا کیوں کریں؟

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ

سورہ حجرات - آیت 6

محدثین کے نزدیک قبولِ خبر کے معیار

- ✓ متصل سند جس میں ہر راوی کا نام ہو
 - ✓ ہر راوی کی عدالت و ضبط - اور لکھا ہوا تذکرہ
 - ✓ خبر کا شذوذ اور خفی علت سے خالی ہونا
 - ✓ ثقہ راویوں کا لفظ و معنی میں باہم موافق ہونا
- علم جس کی نظیر کسی اور قوم میں نہیں

علم جرح و تعدیل: لاکھوں راویوں کے حالاتِ زندگی لکھے اور جانچے گئے

آسان لفظوں میں

یہ خبریں ہم تک منہ در منہ چلنے والی کہانیوں کی صورت میں نہیں پہنچیں۔ یہ ایک مضبوط توثیقی نظام کے ذریعے پہنچی ہیں: ہر خبر کے ساتھ نام بہ نام راویوں کی ایک سند ہے، اور ہر راوی کا ایک لکھا ہوا تذکرہ ہے جو اُس کی سچائی اور حافظے کی چھان بین کرتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

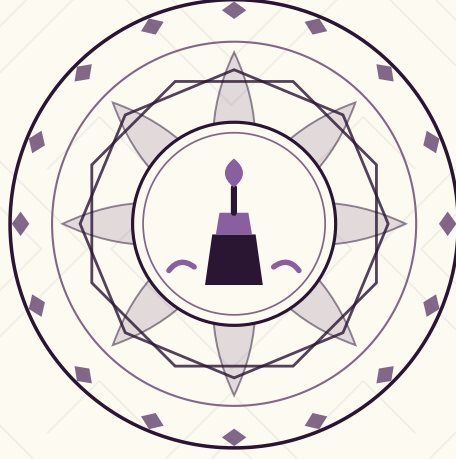
اسلام سے پہلے کی قومیں اپنے انبیا کی خبریں بغیر کسی سند کے نقل کرتی تھیں۔ لہذا معلوم نہیں کہ کس نے کس سے نقل کیا، نہ یہ کہ وہ کب لکھی گئیں، اور نہ یہ کہ نقل کرنے والا قابلِ اعتماد تھا یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوموں کی کتابوں میں صحیح اور گھڑی ہوئی باتیں گڈمڈ ہو گئیں، اور تاریخِ داستان کے ساتھ۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مسلمانوں نے علمِ اسناد اور علمِ جرح و تعدیل ایجاد کیا، اور لاکھوں راویوں کے تذکرے لکھے: ہر ایک کی پیدائش اور وفات، اُس کے اساتذہ، اُس کے شاگرد، اُس کے سفر، اُس کے حافظے کی حالت، اور یہ کہ آیا آخری عمر میں اُس کا حافظہ بگڑ گیا تھا، اور یہ کہ جو کچھ اُس نے روایت کیا اُس میں دوسروں نے اُس کی تائید کی یا نہیں۔ اور رجال کی کتابیں - جیسے تہذیب الکمال اور میزان الاعتدال - اِس موضوع پر ضخیم انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اور آسٹریا کے مستشرق الویس اشپرنگر نے کہا کہ مسلمانوں نے سوانح نگاری کا ایسا علم پیدا کیا جس کی نظیر دوسری قومیں نہیں جانتی تھیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ اِس باب کی خبروں میں وہ خصوصیات جمع ہیں جن سے گزرنا مشکل ہے: اُن کا گواہوں کی بڑی تعداد کے سامنے پیش آنا - خندق میں ایک ہزار، بدر میں تین سو، اور حدیثِ جذع میں ایک پوری بھری مسجد؛ اور اُن کا کئی مستقل طُرُق سے نقل ہونا ایسے صحابہ سے جو انہیں گھڑنے پر جمع نہیں ہوئے تھے؛ اور اُن میں وہ باتیں شامل ہونا جو خوبصورت نہیں بناتیں - جیسے ایک صحابی کی زہر سے موت، اور جابر کا کھانے کی کمی سے ڈرنا؛ اور مخالفین کا انہیں جھٹلانے سے خاموش رہنا، حالانکہ وہ اِس پر سب سے زیادہ حریص تھے۔ اور انسانی تاریخ میں کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جس کی خبریں، اُس کے اقوال اور اُس کے اعمال اِس قدر باریکی اور تفصیل سے نقل ہوئے ہوں۔



پانچواں باب

جِن، جادو اور غیب کی دنیا



ایک حقیقی دنیا جس کی خبر اللہ نے دی، اور ہر قوم کی تاریخ نے اُس کی گواہی دی؛
اور وہ ثابت شدہ واقعات جو نبی ﷺ کے ساتھ، آپ کے صحابہ کے ساتھ، اور آج تک
عام لوگوں کے ساتھ پیش آئے۔

18 دلائل

جنّوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا

کہہ دیجیے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنّوں کی ایک جماعت نے کان لگا کر سنا، پھر کہنے لگے: ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو بھلائی کی راہ دکھاتا ہے، سو ہم اس پر ایمان لے آئے

سورہ جنّ - آیات 1-2



جنّات ایک مکلف مخلوق ہیں: ان میں مسلمان بھی ہیں اور کافر بھی

آسان لفظوں میں

جنّات ایک حقیقی مخلوق ہیں جنہیں اللہ نے آگ سے پیدا کیا۔ ہم انہیں نہیں دیکھتے اور وہ ہمیں دیکھتے ہیں۔ اور قرآن میں **ایک پوری سورت انہی کے نام سے** ہے، جو بتاتی ہے کہ ان کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور اس پر ایمان لے آئی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عرب جنّات کو جانتے تھے اور ان سے ڈرتے تھے؛ بلکہ ان میں سے کچھ لوگ **ان کی پناہ لیتے** تھے، ان کی پوجا کرتے اور سفر میں ان سے حفاظت مانگتے تھے — جسے خود اسی سورت نے بیان کیا: «اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنّوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، سو انہوں نے ان کا بوجھ اور بڑھا دیا»۔ وہ انہیں علمِ غیب کا حامل سمجھتے اور ان سے کہانت سیکھتے تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اسلام نے **نہ ان کے وجود کا انکار کیا اور نہ اس میں مبالغہ** — بلکہ اسے نہایت باریکی سے ضابطے میں لایا: ان کا وجود ایک مکلف مخلوق کے طور پر ثابت کیا جس میں نیک بھی ہیں اور بد بھی؛ ان سے علمِ غیب کی قطعی نفی کی («اور یہ کہ ہم نے گمان کیا تھا کہ انسان اور جنّ اللہ پر ہرگز جھوٹ نہ باندھیں گے»، اور «اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا ہے»); **ان سے پناہ مانگنا حرام کیا** اور اسے شرک ٹھہرایا؛ اور کابنوں اور نجومیوں کے پاس جانا حرام کیا۔ یوں حقیقت کو باقی رکھا اور خرافات اور غلامی دونوں کو مٹا دیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ ایک ایسا توازن ہے جس کی مثال آس پاس کہیں نہیں ملتی۔ مذاہب اور ثقافتیں یا تو ارواح کی دنیا کو اتنا بڑھا دیتی ہیں کہ اسے علم و قوت کا سرچشمہ بنا کر پوجتی اور راضی کرتی ہیں، یا اس کا سرے سے انکار کر کے اسے خرافات قرار دیتی ہیں۔ قرآن نے تیسرا راستہ اختیار کیا: **وجود ثابت کیا، عبادت باطل کی، اور علمِ غیب کی نفی کر دی**۔ اگر یہ کلام اسی ماحول کے کسی آدمی کا گھڑا ہوا ہوتا تو اس کے لیے آسان تر یہ تھا کہ لوگوں کے مانے ہوئے عقیدے کی موافقت کرتا اور اسے اپنے اقتدار کے لیے برتتا — جیسا کہ اس سے پہلے کابن کرتے آئے تھے۔ مگر اس نے کہانت کی پوری تجارت جڑ سے ڈھا دی، حالانکہ وہ جزیرہ عرب کے نفع بخش ترین پیشوں میں سے تھی۔

آگ کے بے دھوئیں شعلے سے

اس نے انسان کو ٹھیکری جیسی کھنکھاتی مٹی سے پیدا کیا، اور جن کو آگ کے بے دھوئیں

شعلے سے

سورہ الرحمن – آیات 14-15



دو بالکل مختلف مادے – اسی لیے ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پاتا

آسان لفظوں میں

ہم **مٹی** سے پیدا کیے گئے ہیں، اور جنات **خالص، بے قرار آگ** سے جس میں دھواں نہیں۔ اور چونکہ مادہ مختلف ہے، اس لیے آپ کی آنکھ انہیں نہیں پا سکتی – جبکہ وہ آپ کو دیکھتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جنات کے بارے میں لوگوں کے تصورات بے ضابطہ عوامی خیال آرائی تھے: بھوت، ارواح اور ڈراؤنی شکلیں۔ نہ ان کی تخلیق کے مادے کی کوئی تعین تھی اور نہ اس کی کوئی توجیہ کہ وہ نظر کیوں نہیں آتے۔ اور یہاں جو عربی لفظ برتا گیا ہے وہ نہایت باریک اور کم استعمال ہونے والا ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عربی لغات میں «مارج» وہ خالص، ملا جلا، بے قرار شعلہ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔ یہ توانائی کی ایک خاص صورت کا بیان ہے، کسی کثیف مادی جسم کا نہیں۔ اور آج سائنس یہ طے کرتی ہے کہ **انسانی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ برقی مقناطیسی طیف کے ایک نہایت معمولی حصے سے آگے نہیں بڑھتا** (تقریباً 400-700 نینومیٹر)، اور یہ کہ کائنات کے مادے اور توانائی کا تقریباً 95% «تاریک» ہے، جو نظر نہیں آتا اور صرف اپنے اثر سے پہچانا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے جہانوں کا وجود جن تک ہمارے حواس نہیں پہنچتے، آج کے سائنسی ذہن کے لیے کوئی عجیب بات نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قرآن نے نظر نہ آنے کی وجہ صراحت کے ساتھ بیان کی، اور وہ نہایت باریک ہے: «وہ اور اس کا قبیلہ آپ کو وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے آپ انہیں نہیں دیکھتے»۔ یعنی دیکھنا ایک ہی رخ میں ہے، دونوں طرف سے نہیں – اور یہ خود ادراک کی نوعیت میں فرق کا تقاضا کرتا ہے، محض چھپ جانے یا پردہ کر لینے کا نہیں۔ پھر تخلیق کے دونوں مادوں کا فرق صلاحیتوں کے فرق کی وضاحت کرتا ہے: رفتار، نفوذ اور شکل کی تبدیلی۔ یہ ایک ایسی توجیہ ہے جو اوّل سے آخر تک اندرونی طور پر ہم آہنگ ہے، قوموں کے اساطیر کی طرح بکھری ہوئی تصویریں نہیں۔

جادو خود نبی ﷺ پر ہوا

رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا، یہاں تک کہ آپ کو خیال ہوتا کہ آپ نے کوئی کام کیا ہے حالانکہ آپ نے وہ نہیں کیا... ایک کنگھی، بالوں کے ریزوں اور نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں، اور وہ ذروان کے کنویں میں تھا

روایت بخاری و مسلم – متفق علیہ



مدینہ کا کنواں ذروان – وہ جگہ جہاں سے جادو نکالا گیا

آسان لفظوں میں

جادو ایک حقیقی چیز ہے جو اثر کرتی ہے، نہ خیال ہے نہ وہم۔ اور اس کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ وہ **خود نبی ﷺ پر ہوا**، تو آپ کو خیال ہوتا کہ آپ نے کوئی کام کیا ہے حالانکہ آپ نے وہ نہیں کیا – یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اس کی جگہ بتا دی اور وہ نکال لیا گیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جادو خطے کی ہر تہذیب میں ایک معروف اور رائج پیشہ تھا: بابل، مصر، یمن اور جزیرہ عرب۔ جادوگر مرتبے، مال اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ اور نبی ﷺ کے لیے یہ نہایت آسان تھا کہ جو آپ کو پیش آیا اسے چھپا لیتے – کیونکہ کسی داعی کی دعوت کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ کوئی بات نہیں کہ یہ کہا جائے کہ جادو نے اسے آلیا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ حدیث **صحیح بخاری اور صحیح مسلم** میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، باریک تفصیلات کے ساتھ: جادوگر کا نام (لبید بن أعصم)، جادو کا مادہ (کنگھی، بال اور کھجور کے خوشے کا چھلکا)، اس کی جگہ (ذروان کا کنواں)، اس کے اثر کی کیفیت، اور وہ کیسے نکالا گیا۔ اور اہل سنت کا اجماع ہے کہ **جادو کی ایک حقیقت اور ایک اثر ہے**، اور یہ کہ اس کا اثر وحی اور تبلیغ تک نہیں پہنچا – بلکہ صرف آپ کے ذاتی دنیوی معاملات تک۔ یہ ایک اہم قید ہے جسے علما نے صراحت سے بیان کیا، کیونکہ تبلیغ میں عصمت قائم ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں دلیل ایک نادر قسم کی ہے: ایسی خبر جس کا ظاہر صاحبِ دعوت کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے باوجود وہ نقل بھی ہوئی اور محفوظ بھی رہی۔ نبی ﷺ نے اسے چھپایا نہیں، صحابہ نے دبایا نہیں، اور محدثین نے حذف نہیں کیا – بلکہ مسلمانوں کی دو صحیح ترین کتابوں نے اسے درج کیا۔ اور جو شخص کوئی دین گھڑتا ہے وہ اپنے بارے میں یہ روایت نہیں کرتا کہ ایک یہودی کے جادو نے اس پر اثر کیا۔ تاریخی تنقید کے ماہرین اسے «**شرمندگی کا معیار**» کہتے ہیں: وہ روایت جو اپنے راوی کو نقصان پہنچائے، اس سے زیادہ سچ کے قریب ہے جو اسے فائدہ دے۔ پھر اس واقعے کا ایک باقی رہ جانے والا ثمر بھی نکلا: **معوذتین**، جو آج تک ہر مسلمان کے لیے ایک عملی علاج ہیں۔

معوذتین... ہر مسلمان کا قلعہ

کہہ دیجیے: میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی... اور
گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے، اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے

سورہ فلق - آیات 1-5



دو سورتیں جو انسان کو جادو اور حسد کے شر سے بچانے کے لیے اتریں

آسان لفظوں میں

جب جادو ہوا تو لوگوں کو بغیر علاج کے نہیں چھوڑا گیا۔ دو مختصر سورتیں اتریں - **الفلق اور الناس** - جن میں جادو، حسد اور شیطان کے وسوسے سے حفاظت ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کو جب جادو لگتا تو وہ کسی دوسرے جادوگر کے پاس جاتے کہ وہ اسے کھولے - یعنی وہ شر کا علاج اسی جیسے شر سے کرتے، اور یوں جادوگروں سے اور زیادہ وابستہ ہوتے اور اور زیادہ مال دیتے۔ یہی وہ چکر تھا جو کابنوں اور جادوگروں کی روزی چلاتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نبی ﷺ ہر رات سونے سے پہلے معوذتین اپنے اوپر پڑھتے، اپنی ہتھیلیوں میں پھونکتے اور ان سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتے، اور بیماروں پر بھی پڑھتے (بخاری و مسلم)۔ اور آپ نے عقبہ بن عامر کو **ہر نماز کے بعد** انہیں پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا: «پناہ مانگنے والوں نے ان جیسی کسی چیز سے پناہ نہیں مانگی»۔ اور صحیح حدیث میں ہے: «جو شخص بستر پر جاتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے، اللہ کی طرف سے اس پر ایک نگہبان رہتا ہے اور صبح تک کوئی شیطان اس کے قریب نہیں آتا»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

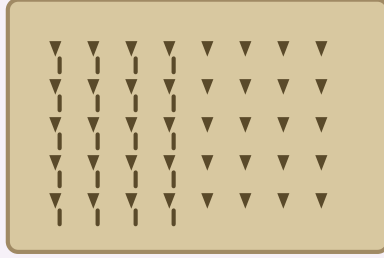
غور کیجیے کہ اس علاج نے پورے سماجی ڈھانچے کے ساتھ کیا کیا۔ اس نے جادو سے حفاظت **براہ راست ہر انسان کے اپنے ہاتھ میں** دے دی: چند مختصر کلمات جو بچہ بھی یاد کر لیتا ہے، بغیر کسی واسطے کے، بغیر کسی اجرت کے، بغیر کسی رسم کے۔ اور اس طرح اس نے جادوگروں اور کابنوں کا اقتدار اور ان کی تجارت جڑ سے ختم کر دی۔ یہ وہ کام نہیں جو لوگوں پر اقتدار چاہنے والا کرتا ہے - وہ تو اس کا الٹ کرتا ہے۔ اور سورت کی سب سے باریک بات: «**گرہوں میں پھونکنے والیاں**» - یہ جادو کی سب سے معروف عملی صورت کا بیان ہے: گرہ لگانا اور اس میں پھونکنا۔ اور بیہقی نے «دلائل النبوة» میں - ایک ضعیف سند سے جو قابلِ حجت نہیں - گیارہ گرہوں والی ایک تانت کا ذکر کیا ہے؛ مگر یہ صحیحین میں ثابت نہیں۔ ثابت ان میں یہ ہے: ایک کنگھی، بالوں کے ریزے، اور نر کھجور کے خوشے کا غلاف۔

بابل... اور تاریخ کی قدیم ترین جادو کی تختیاں

- ❖ اور وہ اس کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت میں پڑھا کرتے تھے۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین نے کفر کیا، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، اور اس کے پیچھے جو بابل میں دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا

سورہ بقرہ – آیت 102

منتر اور تعویذ – ہزار برس سے بھی زیادہ قبل مسیح کے



بابل کی مسماری مٹی کی تختیاں – عجائب گھروں میں محفوظ

جادو کے متون کے پورے کتب خانے عراق کی سرزمین سے برآمد ہوئے

آسان لفظوں میں

قرآن نے جادو کو ایک متعین جگہ سے جوڑا: **بابل**۔ اور ماہرین آثار نے اسی سرزمین سے **قدیم دنیا میں جادو کے متون کا سب سے بڑا ذخیرہ نکالا**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جب قرآن اترا تو بابل ایک مٹا ہوا کھنڈر تھا، صدیوں سے ویران۔ اور کوئی مسماری خط پڑھ نہیں سکتا تھا – وہ بالکل مر چکا تھا۔ چنانچہ جادو کی تعلیم کو دنیا کے سب دارالحکومتوں میں سے **خاص بابل** کی طرف منسوب کرنا ایک ایسی جغرافیائی اور تاریخی تعیین ہے جسے جانچا جا سکتا ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

انیسویں صدی میں مسماری خط کے رموز کھلے۔ تب یہ سامنے آیا کہ بین النہرین – جس کا دل بابل تھا – **قدیم دنیا میں جادو، منتر اور تعویذ کا سب سے بڑا مرکز** تھا۔ سب سے مشہور دریافتوں میں **«مَقْلُو» (Maqlû)** تختیوں کا سلسلہ ہے، جو جادو اور اس کے توڑ پر نو مکمل تختیاں ہیں، اور **«شُرپو» (Šurpu)**، اور منتر، نجوم اور فال گیری کی ہزاروں تختیاں۔ اکیلے آشور بانیپال کے کتب خانے میں ان کی سینکڑوں تختیاں تھیں۔ اور مؤرخین تسلیم کرتے ہیں کہ بابل ہی وہ سرچشمہ تھا جہاں سے یہ فنون پورے خطے میں پھیلے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

جغرافیائی تعیین ہی دلیل کا اصل مقام ہے۔ قرآن نے صرف یہ نہیں کہا کہ «انہوں نے جادو سیکھا» – بلکہ اس **وطن کا نام لیا جہاں سے یہ نکلا**۔ اور بارہ صدیوں بعد ثابت ہوا کہ وہی وطن جادو کے متون کے اعتبار سے روئے زمین کا سب سے مالا مال آثاری مقام ہے۔ اس سے بھی باریک بات **سلیمان علیہ السلام کی براءت** ہے: «اور سلیمان نے کفر نہیں کیا»۔ خطے میں گردش کرنے والی داستانیں – اور بعد کے یہودی متون – جادو کو سلیمان کی طرف منسوب کرتی اور انہیں جادوگروں کا سردار بناتی تھیں۔ سو قرآن آیا اور **ایک نبی کو اس الزام سے بری کیا جو خود اہل کتاب نے ان پر لگایا تھا** – اور یہ اس کے بالکل الٹ ہے جو ان سے نقل کرنے والا کرتا۔

ماخذ Abusch – The Magical Ceremony Maqlû · Reiner – Šurpu

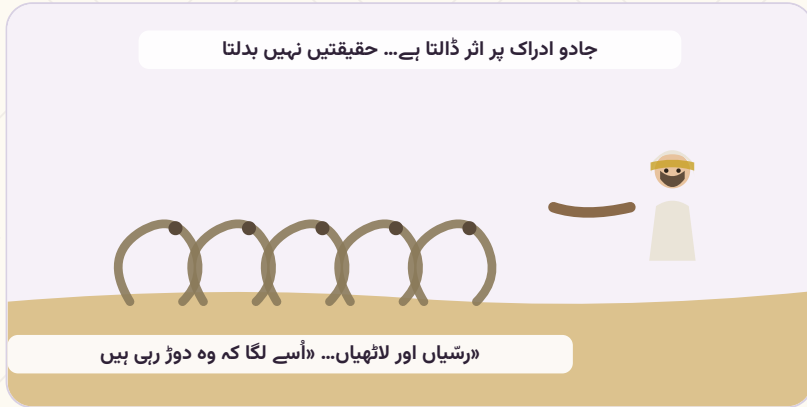
فرعون کے جادوگر... اور دوڑتی ہوئی رسیوں کا منظر

اس نے کہا: بلکہ تم ہی ڈالو۔ تو اچانک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو سے اسے ایسی لگیں

کہ وہ دوڑ رہی ہیں

سورہ طہ - آیت 66

جادو ادراک پر اثر ڈالتا ہے... حقیقتیں نہیں بدلتا



«رسیاں اور لاٹھیاں...» اُسے لگا کہ وہ دوڑ رہی ہیں

قرآن جادو کو آنکھ پر اثر بتاتا ہے، نئی تخلیق نہیں

آسان لفظوں میں

فرعون کے جادوگر رسیاں اور لاٹھیاں لے کر آئے، تو وہ لوگوں کو **دوڑتے ہوئے سانپ** دکھائی دینے لگیں۔ اور باریک الفاظ پر غور کیجیے: «**اسے ایسا لگا**» - یعنی وہ بدلی نہیں تھیں، بلکہ دیکھنے والے کا ادراک متاثر ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم مصر میں جادو اپنے عروج پر تھا، اس کے کابن تھے، مدرسے تھے اور لکھے ہوئے متون تھے۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ جادوگر چیزوں کو حقیقتاً بدل دیتا ہے: لاٹھی کو سانپ اور انسان کو جانور بنا دیتا ہے۔ یہ عقیدہ زمین کی تقریباً ہر تہذیب میں غالب تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قرآن نے اس تصوّر کو صراحتاً رد کیا اور جادو کے اثر کو تین دائروں میں محدود کر دیا: **ادراک اور حواس پر اثر** («اسے ایسا لگا»، «انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا»، **نفوس اور رشتوں پر اثر** («وہ اس سے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں»)، اور **بدن کو ایذا پہنچا کر اثر**۔ رہا چیزوں کی حقیقت کو ہی بدل دینا، تو اس کی سرے سے نفی ہے۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو آج نفسیات تلقین، ہپناٹزم اور اجتماعی فریبِ ادراک کے بارے میں طے کرتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

«ادراک پر اثر» اور «حقیقت کے بدل جانے» کے درمیان یہ فرق نہایت باریک ہے، اور اس زمانے کی ثقافت اسے نہیں جانتی تھی۔ یہی وہ چیز ہے جو جادو کے بارے میں اسلامی موقف کو اپنے گرد و پیش کی ہر چیز سے ممتاز کرتی ہے: نہ وہ ایسا مکمل انکار ہے جو مشاہدے کو جھٹلا دے، اور نہ یہ تسلیم کر لینا کہ جادوگر پیدا کرتا اور پلٹ دیتا ہے۔ اور خود موسیٰ علیہ السلام کے معجزے میں فرق دیکھیے: ان کی لاٹھی نے وہ سب نکل لیا جو انہوں نے بنایا تھا - یعنی حقیقتاً نکل لیا۔ سو قرآن میں معجزے اور جادو کا فرق یہ ہے: پہلا حقیقت میں تبدیلی ہے، اور دوسرا آنکھ میں۔ اور اسی لیے سب سے پہلے خود جادوگر ایمان لائے - کیونکہ وہ اپنے فن کی حدود کو سب سے بہتر جانتے تھے۔

وہ شیطان جو ابوہریرہ کے پاس تین راتیں آیا

اس نے کہا: مجھے چھوڑ دیجیے، میں آپ کو ایسے کلمات بتاتا ہوں جن سے اللہ آپ کو نفع دے گا... جب آپ اپنے بستر پر جائیں تو آیت الکرسی پڑھ لیجیے... نبی ﷺ نے فرمایا: اس نے آپ سے سچ کہا حالانکہ وہ بڑا جھوٹا ہے، وہ شیطان تھا

روایت بخاری - صحیح



رمضان کے صدقے کے گودام میں تین راتیں دہرایا جانے والا واقعہ

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو صدقے کے غلے کی حفاظت پر مقرر کیا۔ تو ایک شخص رات کو اس میں سے چوری کرنے آیا، اور انہوں نے اسے لگاتار تین راتیں پکڑا۔ آخری رات اس نے انہیں **آیت الکرسی** سکھائی اور کہا: اگر آپ اسے پڑھ لیں تو کوئی شیطان آپ کے قریب نہ آئے گا۔ پھر نبی ﷺ نے انہیں بتایا کہ وہ شیطان تھا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

رات کو غلے کے گودام کی پہرہ داری ایک عام سی بات ہے۔ ابوہریرہ نے پہلی بار اسے کوئی مسکین آدمی سمجھا، اس پر رحم کیا اور چھوڑ دیا۔ پھر ایسا تین بار ہوا — اور ہر صبح وہ نبی ﷺ کو بتاتے، تو آپ ان سے فرماتے: **وہ پھر آئے گا** — اور وہ آ جاتا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ واقعہ **صحیح بخاری** میں پورا موجود ہے، کتاب فضائل القرآن میں «سورہ بقرہ کی فضیلت کے باب» کے تحت۔ اور اس میں تین اہم اشارے ہیں۔ پہلا یہ کہ نبی ﷺ **ہر صبح ابوہریرہ کو بتاتے تھے کہ وہ رات کو پھر آئے گا** — اور وہ آ جاتا۔ دوسرا یہ کہ آخری فیصلہ نہایت باریک الفاظ میں آیا: **«اس نے آپ سے سچ کہا حالانکہ وہ بڑا جھوٹا ہے»** — یعنی بات درست ہے اگرچہ کہنے والا فطرتاً جھوٹا ہے۔ تیسرا یہ کہ عملی نتیجہ **ہر مسلمان کے لیے ایک ہتھیار نکلا: سوتے وقت آیت الکرسی۔**

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس واقعے میں سب سے اہم چیز وہ **منہج** ہے جو نبی ﷺ نے اس عالم کے ساتھ معاملہ کرنے میں سکھایا۔ آپ نے نہ واقعے کا انکار کیا اور نہ اسے ہولناک بنایا، بلکہ **بات کا فیصلہ خود بات پر کیا، کہنے والے پر نہیں۔** اور یہ جملہ «اس نے سچ کہا حالانکہ وہ بڑا جھوٹا ہے» خبروں کی تنقید میں ایک مکمل قاعدہ ہے۔ پھر دیکھیے کہ نتیجہ **قرآن کی ایک آیت** نکلی جو ہر کوئی یاد کر لیتا ہے، نہ کوئی رسم، نہ تعویذ، نہ کوئی انسانی واسطہ۔ پورا واقعہ اسی پر ختم ہوتا ہے کہ عام آدمی خود اپنی حفاظت خود کر سکے — اور یہی وہ دھاگا ہے جو اس پورے باب کو جوڑتا ہے۔

ہر انسان کے ساتھ ایک قرین ہے

آپ میں سے کوئی ایسا نہیں جس کے ساتھ جنوں میں سے اس کا قرین مقرر نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ، آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا: اور میرے ساتھ بھی، مگر اللہ نے اس پر میری مدد فرمائی تو وہ مسلمان ہو گیا، سو وہ مجھے بھلائی ہی کا حکم دیتا ہے

روایت مسلم – صحیح



اندرونی کشمکش کی ایسی وضاحت جو برے خیالات کو ان کی صحیح جگہ پر رکھ دیتی ہے

آسان لفظوں میں

ہر انسان کے ساتھ جنوں میں سے ایک قرین ہوتا ہے جو اسے برائی کا وسوسہ ڈالتا ہے۔ یہی ان برے خیالات کی وضاحت ہے جو اچانک آپ کے دل میں آ جاتے ہیں، جو نہ آپ کو مطلوب ہیں نہ پسند۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگ یا تو ہر خیال کو اپنی ہی طرف منسوب کرتے اور خود کو ملامت کرتے کرتے ڈوب جاتے، یا اپنے سارے اعمال کو بیرونی قوتوں کی طرف منسوب کر کے ذمہ داری ہی گرا دیتے۔ اور کوئی ایسی ضابطہ بند وضاحت موجود نہ تھی جو خیال اور فعل کے درمیان فرق کرے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نبی ﷺ نے اس حقیقت کو بیان کیا، پھر اسے نہایت اہم قیود کا پابند کیا: یہ کہ قرین وسوسہ ڈالتا ہے، مجبور نہیں کرتا؛ یہ کہ انسان سے محض خیال پر مواخذہ نہیں ہوتا جب تک وہ عمل نہ کرے («اللہ نے میری اُمت سے وہ معاف کر دیا جو ان کے دلوں میں آئے، جب تک وہ عمل نہ کریں یا زبان سے نہ کہیں»); اور یہ کہ وسوسے کی شدت ایمان کی علامت ہے، فساد کی نہیں – چنانچہ جب صحابہ نے وسوسے کی شکایت کی تو فرمایا: «یہ تو خالص ایمان ہے»، یعنی اس کا بڑا لگنا ہی آپ کے دلوں کی سلامتی کی دلیل ہے۔

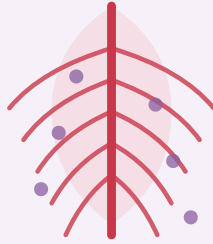
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس تصور کے نفسیاتی اثر کو دیکھیے، اور آج بہت سے لوگوں کی حالت سے موازنہ کیجیے۔ جس شخص کے دل میں کوئی بھیانک خیال آتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی اپنی اصل گہرائیوں سے نکلا ہے، وہ خود اپنے آپ سے دہشت زدہ ہو جاتا ہے – اور مذہبی رنگ والے وسواس قہری میں بالکل یہی ہوتا ہے۔ جبکہ یہ وضاحت جو آپ پر ڈالا جاتا ہے اور جو آپ خود چنتے ہیں کے درمیان فرق کر دیتی ہے، اور فیصلہ کرتی ہے کہ پہلی چیز پر آپ سے مواخذہ نہیں – بلکہ آپ کا اس سے بیزار ہونا ہی آپ کی سلامتی کی دلیل ہے۔ پھر عملی علاج دیتی ہے: پناہ مانگیے اور رک جائیے، اور بحث میں الجھتے نہ رہیے۔ اور یہ اس کے بہت قریب ہے جو جدید نفسیاتی علاج بے اختیار در آنے والے خیالات کے بارے میں تجویز کرتے ہیں: ان سے بحث کر کے مت لڑیے، اور اپنی پہچان انہی سے مت بنائیے۔

وہ ابنِ آدم میں خون کی طرح دوڑتا ہے

بے شک شیطان ابنِ آدم میں خون کی طرح دوڑتا ہے

روایت بخاری و مسلم – متفق علیہ



بدن میں کوئی جگہ اُس کی پہنچ سے دور نہیں

خون کے دوڑنے کی جگہ» – ممکنہ سب سے جامع تشبیہ»

بدن میں کوئی زندہ بافت ایسی نہیں جو خون کے بغیر گزارا کر سکے

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے انسان کے اندر شیطان کی رسائی کو **خون کے دوڑنے جیسا** بتایا – یعنی وہ آپ کے ہر حصے تک پہنچتا ہے، کوئی عضو اس سے خالی نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دورانِ خون معلوم نہیں تھا۔ غالب گمان – اور یہ جالینوس کا مذہب تھا جس نے پندرہ سو سال تک طب پر حکومت کی – یہ تھا کہ خون جگر میں بنتا ہے اور اعضا میں خرچ ہو جاتا ہے، نہ یہ کہ وہ **ایک پورا چکر لگاتا ہے** اور جسم کے ہر حصے تک پہنچ کر لوٹ آتا ہے۔ یہ 1628 میں ولیم ہاروے کے ہاتھوں دریافت ہوا، اور 1661 میں باریک شعیرات کی دریافت سے مکمل ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نظام دوران **جسم کی ہر زندہ بافت** کو خون کی شعیرات کے ایک ایسے جال کے ذریعے غذا پہنچاتا ہے جس کی لمبائی نو ہزار سے انیس ہزار کلومیٹر کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ اور جہاں رنگیں نہیں پہنچتیں – جیسے آنکھ کی قرنہ اور جوڑوں کی غضروف – وہ خون سے رس کر پہنچنے والی رطوبت پر جیتی ہیں۔ سو بدن میں کوئی چیز اس سے بے نیاز نہیں۔ چنانچہ مکمل اور ہمہ گیر نفوذ کے لیے «خون کے دوڑنے» کو تشبیہ بنانا **پورے جسم میں ممکنہ باریک ترین تشبیہ** ہے – اور اس کی باریکی کا رخ دورانِ خون جانے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔

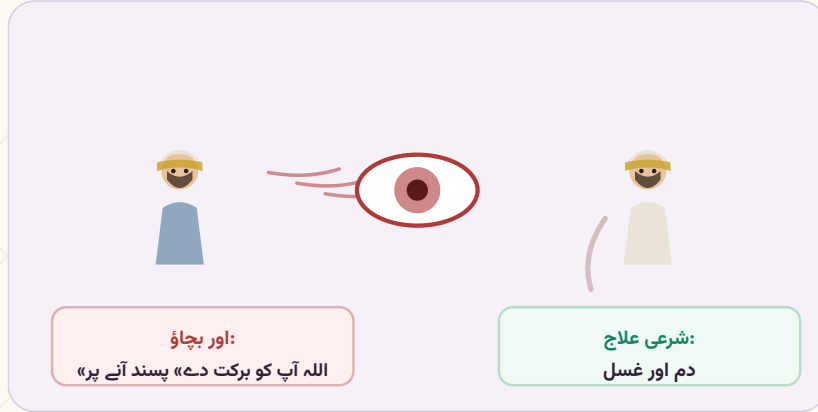
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ تشبیہ یونہی نہیں چنی گئی۔ اگر محض قرب مقصود ہوتا تو کہا جاتا «سائے کی طرح» یا «سانس کی طرح» – اور یہ دونوں اس زمانے کے تصورات سے زیادہ قریب تھیں۔ مگر مراد **ہمہ گیری اور ہر ہر حصے تک نفوذ** تھی، اور جسم میں یہ خاصیت صرف خون ہی میں پائی جاتی ہے – ایک ایسی خاصیت جو دس صدیوں بعد تک معلوم نہ ہو سکی۔ اور وہ عملی سبق دیکھیے جو نبی ﷺ نے اس پر قائم کیا: آپ نے یہ بات اس وقت فرمائی جب رات کو صفیہ رضی اللہ عنہا کو مسجد سے لے کر نکل رہے تھے؛ دو آدمی گزرے تو تیز چل دیے، آپ نے انہیں روکا اور فرمایا: «ٹھہریے، یہ صفیہ بنت حُیّ ہیں»۔ یعنی آپ نے اس قاعدے کو **بدگمانی کو پہلے ہی اپنے سے دور کرنے** کا سبب بنایا – یہ سبق شفافیت کا ہے، ڈرانے کا نہیں۔

نظر حق ہے... اور ایک واقعہ جو صحابہ کے سامنے پیش آیا

نظر حق ہے، اور اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھ سکتی تو نظر آگے بڑھ جاتی۔ اور جب آپ سے غسل کرنے کو کہا جائے تو غسل کر لیجیے

روایت مسلم – صحیح



سہل بن حنیف اور عامر بن ربیعہ کا واقعہ – روایت مالک، احمد اور نسائی

آسان لفظوں میں

«نظر حق ہے» – یعنی تعریف یا حسد کی نگاہ واقعی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اور معاملہ بغیر علاج کے نہیں چھوڑا گیا: **دم اور غسل**، اور بچاؤ یہ کہ جسے کوئی چیز اچھی لگے وہ اس کے لیے برکت کی دعا کرے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

نظر کا خوف عربوں میں بھی تھا اور دوسروں میں بھی، اور وہ اس سے بچنے کے لیے تعویذ، منکے، گنڈے، ہڈیاں اور جانوروں کی آنکھیں لٹکاتے تھے۔ یعنی وہ ایک عقیدے کا مقابلہ ایک دوسری خرافات سے کرتے تھے، اور اس کی قیمت بھی چکاتے تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مشہور واقعہ امام مالک نے موطا میں اور احمد و نسائی نے روایت کیا ہے: **سہل بن حنیف** نے غسل کیا تو **عامر بن ربیعہ** نے انہیں دیکھا اور کہا: «میں نے آج جیسا کبھی نہیں دیکھا، اور نہ کسی پردہ نشین کی ایسی کھال» – سہل اسی وقت گر پڑے اور بیمار ہو گئے۔ نبی ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا: «آپ میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے؟ برکت کی دعا کیوں نہ کی؟»، پھر عامر کو حکم دیا کہ وضو کریں اور وہ پانی سہل پر ڈالا جائے – تو سہل تندرست اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہ سفر میں صحابہ کی ایک جماعت کے سامنے پیش آیا۔

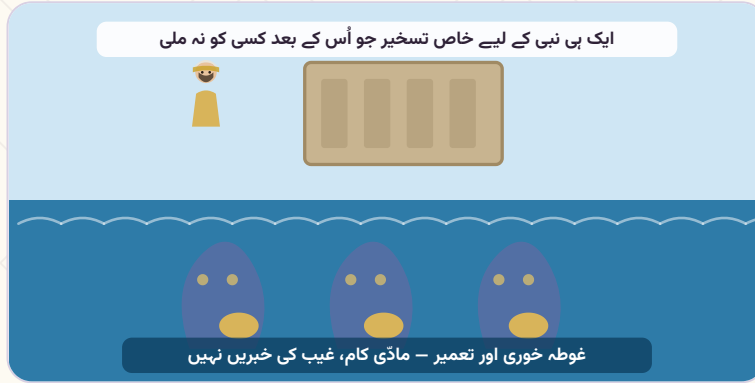
یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس واقعے میں تین باتیں ٹھہر کر سوچنے کے لائق ہیں۔ پہلی: کہ **نظر لگانے والا کوئی حسد کرنے والا دشمن نہ تھا**، بلکہ محبت کرنے والا، تعریف کرنے والا تھا – اور یہ اس عام تصور کو توڑ دیتا ہے کہ نظر صرف دشمن ہی سے لگتی ہے۔ دوسری: کہ علاج **لگانے والے کی طرف سے تھا**، جس کو لگی اس کی طرف سے نہیں – نظر لگانے والا غسل کرتا ہے اور پانی متاثرہ پر ڈالا جاتا ہے۔ اور یہ ان تمام رسموں کے الٹ ہے جو تعویذ متاثرہ پر باندھتی تھیں۔ تیسری – اور یہی سب سے اہم ہے – کہ نبی ﷺ نے **تعویذوں کو قطعی طور پر حرام کیا** («جس نے تعویذ لٹکایا اس نے شرک کیا») اور اس کے بدلے ایک سادہ، مفت، عملی علاج دیا۔ سو انہوں نے ایک ہی وقت میں اس ظاہرے کو ثابت بھی کیا اور اس سے جڑی خرافات کو باطل بھی کر دیا – اور یہی اس پورے باب کا انداز ہے۔

سلیمان علیہ السلام اور تابع کیے گئے جن

اور شیطانوں میں سے کچھ ایسے تھے جو اُن کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے علاوہ بھی کام کرتے تھے، اور ہم ہی اُن کے نگہبان تھے

سورہ انبیا — آیت 82



متعین اور محدود کام: غوطہ خوری، موتی نکالنا اور تعمیر

آسان لفظوں میں

اللہ نے سلیمان علیہ السلام کے تابع جنوں کی ایک جماعت کر دی جو اُن کے لیے کام کرتی تھیں: **سمندر میں غوطے لگاتے اور عمارتیں بناتے تھے۔** یہ معجزہ انہی کے ساتھ خاص تھا؛ انہوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ اُن کے بعد کسی کو نہ ملے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس خطے کی رائج کہانیاں سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو اور ایسے کلمات و طلسمات سے روحوں پر قابو پانے کی نسبت کرتی تھیں جو جادوگر نسل در نسل منتقل کرتے رہے۔ اس بارے میں اُن کی طرف منسوب کتابیں لوگوں میں گردش کرتی تھیں — سب گھڑی ہوئی اور جھوٹی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قرآن نے اس مسئلے کو سخت قیود کے ساتھ متعین کیا۔ اوّل یہ کہ تسخیر **صرف اللہ کے اذن سے** تھی، کسی جادوئی علم سے نہیں: «اور جنوں میں سے کچھ اپنے رب کے اذن سے اُن کے سامنے کام کرتے تھے»۔ دوم یہ کہ کام **مادی اور محدود** تھے: غوطہ خوری، تعمیر اور نقل و حمل — نہ علم غیب، نہ تقدیر میں تصرف۔ سوم، اور یہ سب سے صریح ہے، کہ قرآن نے اسی قصے کے اندر **جنوں کے غیب سے ناواقف ہونے** کو صاف بیان کیا: سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی وہ کام کرتے رہے جبکہ وہ اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، اور انہیں معلوم تک نہ ہوا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں، «پھر جب وہ گرے تو جنوں پر کھل گیا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلیل کرنے والے عذاب میں نہ پڑے رہتے»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس عجیب تضاد کو دیکھیے: جو قصہ جنوں کو تابع کرنے کا سب سے بڑا اشتہار بن سکتا تھا، اُسی کو غیب کا علم نہ رکھنے پر اُن کے عجز کی قطعی دلیل بنا دیا گیا۔ جو جن غوطے لگاتے اور عمارتیں بناتے تھے، وہ اپنے سامنے کھڑے آدمی کی موت تک نہ جان سکے! اگر یہ متن کسی انسان کا ہوتا، اُس ماحول میں جو کہانت کو بڑا مانتا تھا، تو وہ اپنی ہی بنائی ہوئی کہانی کو اُسی آیت میں اپنے ہاتھ سے نہ ڈھاتا۔ پھر سلیمان علیہ السلام نے دعا کی: «اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو» — تو ہر اُس شخص کے سامنے دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا جو اُن کے بعد جنوں کو تابع کرنے کا دعویٰ کرے۔ جس قصے سے جادوگر دلیل پکڑتے ہیں، حقیقت میں وہی اُن کے دعوے کو سب سے زیادہ توڑتا ہے۔

بعثت کے بعد کہانت کیوں بند ہو گئی؟

اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اُسے سخت پھرے داروں اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا ﴿اور یہ کہ ہم اُس کے ٹھکانوں میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے، مگر اب جو سننا چاہے وہ اپنے لیے ایک شعلہ گہات میں پائے گا﴾

سورہ جن - آیات 8-9



ایک نمایاں سماجی واقعہ: بعثت کے آغاز پر کہانت کا زوال

آسان لفظوں میں

کابن ایسی باتیں بتاتے تھے جو کبھی کبھی سچ نکل آتی تھیں، کیونکہ شیاطین آسمان کی خبر میں سے کچھ سن لیتے اور اُن تک پہنچا دیتے تھے۔ پھر جب نبی ﷺ مبعوث ہوئے تو انہیں اس سے روک دیا گیا، اُن کا سرچشمہ کٹ گیا اور اُن کا پیشہ ختم ہو گیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرہ عرب میں کہانت ایک مکمل سماجی ادارہ تھی: کابن کو مرتبہ، مال اور اثر حاصل تھا، جھگڑوں میں اُس سے فیصلہ کرایا جاتا اور پوشیدہ باتوں کے بارے میں اُس سے پوچھا جاتا۔ سب سے مشہور ناموں میں سطیح، شق اور سواد ہیں۔ اور کبھی کبھار اُن کی بات کا سچ نکل آتا ہی اُن کا مرتبہ قائم رکھتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

تاریخی مآخذ اور سیرت کی کتابیں بتاتی ہیں کہ نبی ﷺ کی بعثت کے وقت خود کابنوں نے اپنے اوپر سے خبر کے کٹ جانے کی شکایت کی، اور اُن میں سے بہتوں نے اپنی قوم کو یہ بات بتائی — بلکہ یہی بعض کے اسلام لانے کے اسباب میں سے تھا۔ اور تاریخی طور پر یہ قابل مشاہدہ ہے کہ اسلام کے بعد پرانے مفہوم والی کہانت جزیرہ عرب سے تقریباً پوری طرح مٹ گئی، حالانکہ وہ سماجی زندگی کے ستونوں میں سے ایک تھی۔ اور صحیحین میں اس کا طریقہ بیان ہوا ہے: «پھر وہ اُسے اپنے نیچے والے کی طرف ڈالتا ہے... پھر وہ اُس کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتے ہیں»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

نبی ﷺ صرف ممانعت پر نہیں رکے، بلکہ انہوں نے اس ظاہرے کا راز ایسے کھولا کہ وہ اندر ہی سے ٹوٹ گئی۔ آپ سے کابنوں کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: «وہ کچھ بھی نہیں»۔ لوگوں نے کہا: وہ کبھی کبھی ہمیں ایسی بات بتاتے ہیں جو سچ نکلتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «یہ سچی بات ہوتی ہے جسے جن اُچک لیتا ہے اور اپنے دوست کے کان میں ڈال دیتا ہے، پھر وہ اُس کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتے ہیں»۔ یہ اُس چیز کی نہایت باریک تفسیر ہے جسے آج نفسیات میں «تصدیقی تعصب» کہا جاتا ہے: لوگ ایک بار کے صحیح نکلنے کو یاد رکھتے ہیں اور سو بار کی ناکامی بھول جاتے ہیں۔ تو آپ نے کہانت کو محض خشک انکار سے نہیں، بلکہ اُس شمارباتی طریقے کو بے نقاب کر کے باطل کیا جس پر وہ کھڑی تھی — اور یہی وہ دلیل ہے جو آج سائنس نجوم اور قسمت کا حال بتانے کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

اے ساریہ... پہاڑ!

عمر نے منبر پر ہوتے ہوئے پکارا: اے ساریہ، پہاڑ!... پھر قاصد نے کہا: ہم نے عمر کی آواز سنی تو ہم نے اپنی پیٹھیں پہاڑ کی طرف کر لیں، پس اللہ نے ہمیں فتح عطا فرمائی

بیہقی، ابنِ عساکر اور دیگر نے روایت کیا - ایک جماعت نے حسن کہا



ایک کرامت جسے تابعین نے روایت کیا اور اہل علم نے اپنی کتابوں میں نقل کیا

آسان لفظوں میں

عمر بن الخطاب مدینہ میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک پکار اٹھے: «اے ساریہ... پہاڑ!» اور ساریہ سیکڑوں میل دور ایک لشکر کے سالار تھے۔ جب لشکر لوٹا تو انہوں نے کہا: ہم نے عمر کی آواز سنی، تو ہم پہاڑ کی پناہ میں چلے گئے اور فتح پائی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مدینہ اور میدانِ جنگ کے درمیان اونٹوں پر قاصدوں کے سوا رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اور اُس میں ہفتے لگتے تھے۔ خطبہ مدینہ کے تمام لوگوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ لوگوں نے یہ پکار سنی، عجیب سمجھی، اور اُس وقت اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ خبر بیہقی نے «دلائل النبوة» میں، ابنِ عساکر نے «تاریخ دمشق» میں، ابو نعیم، ابن الاثیر اور دیگر نے کئی سندوں سے روایت کی ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت نے مجموعِ طرق کی بنا پر اسے حسن کہا، اور ابن حجر، ابن کثیر اور ابن تیمیہ نے اس کا ذکر کیا۔ یہ منقول کراماتِ صحابہ میں سب سے مشہور ہے۔ اور اس کی مثالیں ثابت ہیں: **علاء بن الحضرمی** اور اُن کا لشکر پانی پر چل کر خلیج عبور کر کے دارین پہنچے؛ **خالد بن الولید** نے زہر پیا اور اُس نے انہیں نقصان نہ پہنچایا؛ اور **سعد بن ابی وقاص** نبی ﷺ کی دعا سے مستجاب الدعوات تھے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

معجزہ اور کرامت کا فرق اس باب کی ایک اہم بنیاد ہے۔ معجزہ نبی کے ہاتھ پر چیلنج کے طور پر اور نبوت کے ثبوت کے لیے ظاہر ہوتا ہے، اور کرامت نیک بندے سے **بغیر کسی چیلنج اور بغیر کسی دعوے** کے صادر ہوتی ہے۔ اسی لیے کرامت نہ مانگی جاتی ہے نہ اس پر فخر کیا جاتا ہے، اور نہ اس کے صاحب کے لیے جائز ہے کہ اس پر کوئی دعویٰ کھڑا کرے۔ اور جو اسے طلب کرے اور اس سے کمائی کرے، وہ لوگوں میں اس سے سب سے زیادہ دور ہے۔ یہی وہ ضابطہ ہے جو اسلام کو اُس ہر چیز سے الگ کرتا ہے جو آج «روحانی توانائی»، «فتح» اور «کشف» کے نام پر بیچی اور خریدی جاتی ہے۔ اور عمر سے اُن کی پکار کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے منہ پھیر لیا اور کوئی وضاحت نہ کی - اہل کرامت کا اپنی کرامت کے ساتھ یہی رویہ ہوتا ہے۔

ہر بیماری آسیب نہیں – لازمی فرق

اللہ کے بندو، علاج کرو، کیونکہ اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں رکھی جس کے لیے دوا نہ رکھی ہو،
سوائے ایک بیماری کے: بڑھاپا

ابو داود اور ترمذی نے روایت کیا – صحیح

پہلے: ڈاکٹر کے پاس جائیں

- عضوی مرگی
- وٹامن کی کمی
- غدے کی خرابی
- معلوم نفسیاتی امراض
- کم خوابی اور تھکن

پھر شرعی دم

- قرآن کی تلاوت، بلا گراں اجرت
- نہ رسوم نہ لوہان
- نام اور ماں کا نام پوچھے بغیر
- عورت سے خلوت کے بغیر
- اور مریض خود کو دم کرے

جو ان ضوابط کو توڑے وہ شعبہ باز ہے، دم کرنے والا نہیں

صحیح ترتیب: پہلے طب، پھر اپنی حدود کے ساتھ دم

آسان لفظوں میں

اسلام نے آسیب اور جادو کو ثابت کیا، لیکن ہر بیماری کو ان دونوں میں سے نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ پہلے علاج کا حکم دیا، اور دم کو ایسا قرآن بنایا جسے مریض بغیر کسی واسطے، بغیر اجرت اور بغیر رسومات کے خود اپنے اوپر پڑھے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اسلام سے پہلے قومیں اکثر بیماریوں کو روحوں اور شیاطین کی طرف لوٹاتی تھیں، تو مریض کا علاج رسومات، جنوں کے لیے ذبح اور تعویذوں سے کیا جاتا۔ یہ سلسلہ یورپ میں صدیوں چلتا رہا، یہاں تک کہ سترہویں صدی میں جادو کے الزام میں عورتیں جلائی گئیں۔ اور ذہنی مریضوں کے ساتھ آسیب زدہ جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نبی ﷺ نے صاف صاف علاج کا حکم دیا اور فرمایا: «ہر بیماری کی ایک دوا ہے»، اور آپ نے شہد، پچھنے اور کلونجی استعمال کی، اور اپنے صحابہ کے لیے متعین دوائیں تجویز کیں۔ آپ نے فرمایا: «شفا تین چیزوں میں ہے: شہد کا گھونٹ، پچھنا لگانے والے کا نشتر، اور آگ سے داغنا»۔ اور آپ نے اُبی بن کعب کے پاس ایک طبیب بھیجا جس نے اُن کا علاج کیا، اُن کی ایک رگ کاٹی پھر اُسے داغا (مسلم)۔ رہا دم، تو علما کے نزدیک اس کی تین شرطیں ہیں: وہ اللہ کے کلام یا اُس کے ناموں سے ہو، عربی زبان میں ہو یا کسی اور زبان میں جس کا معنی معلوم ہو، اور یہ اعتقاد ہو کہ وہ ایک سبب ہے، بذاتِ خود مؤثر نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہی ضابطہ لوگوں کو دو بڑے نقصانوں سے بچاتا ہے۔ پہلا: کسی جسمانی بیماری کا طبی علاج چھوڑ دینا یہ سمجھ کر کہ وہ آسیب ہے – اور اس نے بہتوں کو مار ڈالا ہے۔ دوسرا: شعبہ بازوں کے ہاتھ چڑھ جانا جو خوف سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور مال و آبرو لوٹتے ہیں۔ اسی لیے نبی ﷺ نے اس باب میں بہت سختی فرمائی: «جو کسی عراف کے پاس آیا اور اُس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا، اُس کی چالیس رات کی نماز قبول نہیں ہوگی»، اور «جو کسی کاہن کے پاس آیا اور اُس کی بات کی تصدیق کی، اُس نے اُس چیز کا انکار کیا جو محمد پر اتاری گئی»۔ تو جو دروازہ حقیقت ثابت کرنے کے لیے کھولا گیا تھا، اُسے استحصال کے سامنے مضبوطی سے بند کر دیا گیا۔ اور جو دم کرنے والا آپ سے آپ کا نام اور آپ کی ماں کا نام پوچھے، یا ذبیحہ، آپ کی کوئی چیز یا بہت سا مال مانگے – وہی وہ شعبہ باز ہے جس سے نبی ﷺ نے خاص طور پر خبردار کیا۔

ہر قوم اس عالم کو جانتی رہی ہے

اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا: اے گروہ جن! تم نے انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا بنا لیا۔ اور انسانوں میں سے اُن کے ساتھی کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا

سورہ انعام — آیت 128

عام انسانی مظہر جس کی مکمل ثقافتی تفسیر نہیں



بابل
شیدو



مصر
اخو



یونان
ڈائمن



ہند
بھوت



چین
گوئی

امتنیں جنہیں نہ زمانہ جوڑتا، نہ مکان، نہ زبان... اور متفق ہوئیں

کسی نادیدہ باشعور عالم کا عقیدہ ہر معلوم تہذیب میں موجود ہے

آسان لفظوں میں

تاریخ کی ہر قوم — بابل، مصر، یونان، ہند، چین اور افریقہ و امریکہ کے لوگ — باشعور نادیدہ مخلوقات کے وجود کو جانتی رہی ہے، اور اُن کے مختلف نام رکھے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ قومیں ایک دوسرے سے دور اور ناواقف تھیں، نہ کوئی مشترک زبان تھی نہ تجارت۔ پھر بھی اُن کے تصورات حیرت انگیز حد تک ملتے جلتے تھے: باشعور مخلوقات، جو کھنڈروں اور ویرانوں میں بستی ہیں، نقصان بھی پہنچاتی ہیں اور نفع بھی، قربانیوں سے راضی کی جاتی ہیں، اُن میں نیک بھی ہیں اور بد بھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ماہرینِ بشریات اسے «ثقافتی عمومیت» (Cultural Universal) کہتے ہیں: ایسا ظاہر جو بلا استثنا ہر معلوم معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ باشعور روحانی مخلوقات کا عقیدہ اس کی واضح ترین مثالوں میں سے ہے، اور جارج مرڈوک نے اسے ثقافتی عمومیت کی اپنی مشہور فہرست میں درج کیا ہے۔ اور اُن کے نام: بابل میں «شیدو»، مصر میں «اخو»، یونان میں «ڈائمن»، ہند میں «بھوت»، اور عربوں کے ہاں «جن»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ یہاں بذاتِ خود کوئی قطعی دلیل بنا کر پیش نہیں کیا جا رہا — محض اتفاق اکیلا صحت ثابت نہیں کرتا۔ لیکن یہ اُس تعبیر کو توڑ دیتا ہے جو کہی جاتی ہے: کہ جن ایک عربی توہم ہیں جسے قرآن نے اپنے ماحول سے نقل کر لیا۔ یہ ظاہر عربوں سے ہزاروں سال پرانا ہے اور اُن سے پورے براعظموں تک وسیع ہے۔ اور اس سے زیادہ باریک بات یہ ہے کہ قرآن نے رائج تصور کو نقل نہیں کیا بلکہ اُس کی تصحیح کی: تمام قومیں اُن کی پوجا کرتی اور اُن کے لیے قربانیاں پیش کرتی تھیں، تو قرآن نے یہ حرام کیا اور اسے شرک کہا؛ وہ اُن کی طرف علمِ غیب کی نسبت کرتی تھیں، تو قرآن نے اس کی قطعی نفی کی؛ وہ اُنہیں نیم خدا بناتی تھیں، تو قرآن نے اُنہیں ایک مکلف مخلوق بنایا جس کا حساب ہوگا جیسے ہمارا ہوگا۔ تو اصل وجود میں اتفاق، اور حکم میں پورا اختلاف — اور یہ مصحح کا شیوہ ہے، ناقل کا نہیں۔

پانچ باتیں جنہیں صرف اللہ جانتا ہے

بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، اور وہی بارش اتارتا ہے، اور جانتا ہے جو ماؤں کے پیٹ میں ہے۔ اور کوئی جان نہیں جانتی کہ وہ کل کیا کمائے گی، اور کوئی جان نہیں جانتی کہ وہ کس زمین میں مرے گی

سورہ لقمان – آیت 34

غیب کا دروازہ بند – دعویٰ پہلے ہی مردود



قیامت کا وقت



بارش کا نزول



جو رحموں میں ہے



کل کی کمائی



موت کی سرزمین

جو ان میں سے کسی ایک کے علم کا دعویٰ کرے، قرآن کی نص سے جھوٹا ہے
اور نہ کوئی نبی مستثنیٰ ہے، نہ ولی، نہ جن

ایک قطعی حد جو ہر دعویدار کا راستہ کاٹ دیتی ہے

آسان لفظوں میں

اس باب میں جو کچھ گزرا، اُس کے بعد قرآن دروازہ مضبوطی سے بند کر دیتا ہے: **پانچ چیزیں ایسی ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔** تو جس نے ان میں سے کسی کا علم ہونے کا دعویٰ کیا – وہ جو بھی ہو – وہ جھوٹا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کہانت، عرافت، نجوم اور قسمت کا حال بتانا پر تہذیب میں چلتے ہوئے پیشے تھے۔ کابن سے غیب کے بارے میں پوچھا جاتا اور وہ جواب دیتا، اور کبھی اُس کی بات ٹھیک نکل آتی تو اُس کا مرتبہ بڑھ جاتا۔ اور یہ روزی اور اثر و رسوخ کے بڑے دروازے تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ پانچ اسی آیت میں مذکور ہیں، اور نبی ﷺ نے انہیں ابن عمر کی حدیث میں «غیب کی پانچ کنجیاں» کہا (بخاری)، اور جبریل والی حدیث میں اپنے اس قول پر یہی آیت تلاوت فرمائی: «پانچ چیزوں میں، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا»۔ اور دیکھیے کہ یہ کوئی مبہم اور دھندلی باتیں نہیں، بلکہ **جانچی جا سکتی ہیں**: تاریخ میں کوئی قیامت کا دن متعین نہ کر سکا، نہ یقین کے ساتھ بارش برسنے کا فیصلہ کر سکا (اور موسمیات احتمال دیتی ہے، یقین نہیں)، اور نہ ہی کوئی رحم میں جو کچھ ہے اُسے **پوری طرح** جان سکا – اُس کا انجام، رزق، عمر اور عمل۔ رہا الٹراساؤنڈ سے جنس معلوم کرنا، تو وہ بننے کے بعد جو ظاہر ہوا اُسے دیکھنا ہے، اُس سے پہلے غیب کا علم نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ حد اس پورے باب کا **حفاظتی والو** ہے۔ کیونکہ جو کچھ گزرا – جن، جادو، نظر اور کرامات کا اثبات – وہ دجل اور استحصال کے لیے ایک وسیع دروازہ کھول سکتا تھا۔ تو یہ آیت پہلے ہی ہر دعویدار کا راستہ کاٹنے کے لیے آئی: **جو آپ کو آپ کے کل کی خبر دے، وہ جھوٹا ہے، چاہے باقی باتوں میں کتنا ہی سچا دکھائی دے۔ اور خود نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے بارے میں یہ اعلان کریں: «کہہ دیجیے: میں اپنے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائی سمیٹ لیتا»۔** تو جو یہ دین لے کر آیا، اُس نے سب سے پہلے اپنے آپ سے اُس چیز کی نفی کی جس کا دعویٰ اُس کے زمانے کے کابن کرتے تھے۔ اقتدار کا طالب کوئی دعویدار ایسا نہیں کرتا۔

آپ کا روزانہ کا قلعہ... ایسے کلمات جو مفت ہیں

جو شخص شام کے وقت یہ کہے: میں اللہ کے کامل کلمات کی پناہ چاہتا ہوں اُس کے شر سے جو اُس نے پیدا کیا — تو اُس رات اُسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی

مسلم نے روایت کیا — صحیح

1	2	3	4
آیت الکرسی	معوذات	صبح کے اذکار	بسم اللہ
سوتے وقت	صبح تین بار	اور شام	داخل ہوتے وقت
»اسے کچھ نقصان نہ ہوا« جیسی کسی چیز سے پناہ نہیں مانگی» صبح تک محافظ			»تمہارا بسیرا نہیں«

نہ واسطہ، نہ اجرت، نہ رسوم — اور ہر ایک کی پہنچ میں

صحیح میں ثابت چار اذکار جو باقی سب سے بے نیاز کر دیتے ہیں

آسان لفظوں میں

انسان کو اس عالم کے سامنے بے ہتھیار نہیں چھوڑا گیا۔ نبی ﷺ نے اُسے ایسے مختصر اذکار دیے جو بچہ بھی یاد کر لے، جنہیں وہ خود بغیر کسی واسطے، بغیر مال اور بغیر رسومات کے پڑھتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جنوں اور حسد سے بچاؤ کے لیے ایک واسطہ ضروری سمجھا جاتا تھا: کوئی کاہن، جادوگر یا تعویذ بنانے والا۔ لوگ اس کے لیے مال اور ذبیحے دیتے، اور ایسی چیزوں سے لپٹے رہتے جو وہ اپنے بچوں اور جانوروں کے گلے میں لٹکاتے۔ یہ ایسا نظام تھا جو محتاجی اور خوف پیدا کرتا اور اپنے چلانے والوں کو نفع پہنچاتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

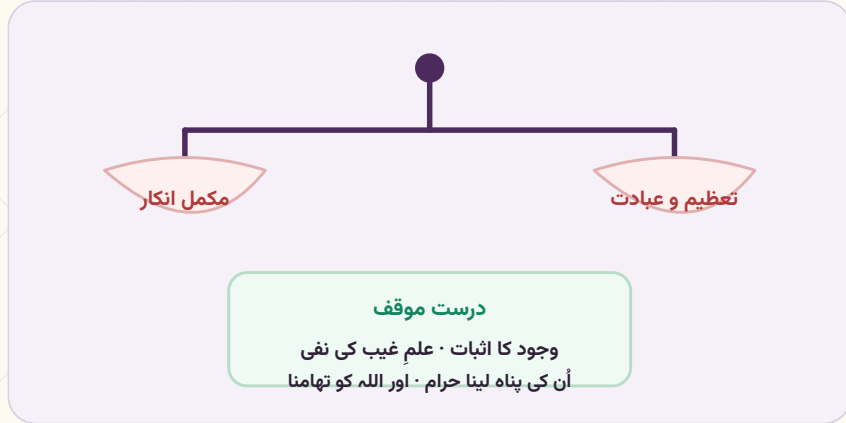
صحیح میں ثابت اذکار بہت ہیں، اور سب سے مشہور یہ ہیں: سوتے وقت آیت الکرسی — »اللہ کی طرف سے آپ پر ایک نگہبان رہے گا اور کوئی شیطان آپ کے قریب نہ آئے گا«؛ صبح و شام تین بار معوذتین اور سورہ اخلاص — »یہ آپ کو ہر چیز سے کافی ہو جائیں گی«؛ »اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق« — »اُس رات اُسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی«؛ گھر میں داخل ہوتے اور کھانے کے وقت بسم اللہ کہنا — »تمہارے لیے نہ رات بسر کرنے کی جگہ ہے نہ کھانا«؛ اور گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت — »اُس میں شیطان داخل نہیں ہوتا«۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اُس ڈھانچے کو دیکھیے جو اس دین نے کھڑا کیا، اور اِس کا موازنہ اُس سے کیجیے جو پہلے تھا۔ اس نے حفاظت کو واسطے کی اجارہ داری سے نکال کر ہر فرد کی ملکیت بنا دیا۔ تو مسلمان کو نہ کسی دم کرنے والے کی ضرورت ہے، نہ کاہن کی، نہ تعویذ کی، نہ اجرت کی — کچھ کلمات ہیں جو وہ یاد کرتا اور خود پڑھتا ہے، اور وہ غریب کی پہنچ میں اُسی طرح ہیں جیسے امیر کی۔ یہ شعبہ بازی کی معیشت کو جڑ سے ڈھا دیتا ہے، اور اُس کی جگہ کوئی متبادل اقتدار کھڑا نہیں کرتا۔ پھر دیکھیے کہ یہ سب اذکار اللہ کی پناہ ہیں، نہ جنوں کی نہ ناموں کی — تو یہ عین اُسی وقت توحید سکھاتے ہیں جس وقت حفاظت کرتے ہیں۔ اور یہی شرعی دم اور باقی ہر چیز کے درمیان بنیادی فرق ہے۔

اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ پکرتے تھے، تو انہوں نے
اُن کی سرکشی اور بڑھا دی

سورہ جن - آیت 6



ایک طرف وہ انکار جو وحی کو جھٹلاتا ہے، دوسری طرف وہ تعظیم جو شرک تک لے جاتی ہے

آسان لفظوں میں

غیب کا عالم ایک حقیقت ہے، لیکن اُس کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک **باریک میزان** ہے: نہ ہم اُس کا انکار کریں کہ اللہ نے جو خبر دی اُسے جھٹلا بیٹھیں، اور نہ اُس کی اتنی تعظیم کریں کہ شرک، خوف اور دجل میں جا پڑیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پرانے زمانے کے لوگ ایک انتہا میں پڑ گئے: تعظیم، پناہ پکڑنا، قربانیاں اور کہانت۔ اور آج بہت سے لوگ دوسری انتہا میں پڑے ہیں: ہر اُس چیز کا انکار جو آنکھ نہیں دیکھتی۔ اور دونوں انتہائیں غلط ہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قرآن و سنت نے جو موقف طے کیا وہ پانچ ایسے اصولوں کو جمع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے: **وجود کا اثبات** - کہ یہ غیب پر ایمان کا حصہ ہے؛ **اُن سے علم غیب کی نفی** - تو نہ کہانت ہے نہ نجوم؛ **اُن کی پناہ پکڑنے کی حرمت** اور اُسے شرک ٹھہرانا؛ **علاج کا حکم** اور گمانوں پر طب کو مقدم کرنا؛ **اللہ کے ذکر سے حفاظت** بغیر کسی واسطے، بغیر اجرت اور بغیر رسومات کے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ پورا نظام مل کر خود دلیل ہے۔ اگر یہ دین اُس ماحول میں کسی انسان کا بنایا ہوا ہوتا، تو اُس کے لیے سب سے آسان - اور سب سے نفع بخش - یہ تھا کہ وہ کہانت کی چلتی ہوئی لہر پر سوار ہو جاتا: غیب کا علم اپنے لیے ثابت کرتا، اپنے پیروکاروں کے لیے ایک ایسا واسطہ بناتا جو انہیں کمائی دیتا، اور لوگوں کے مجہول سے خوف پر ایک روحانی اقتدار کھڑا کرتا۔ اور بہت سی قوموں میں مذہبی اداروں نے یہی کیا۔ لیکن جو یہ دین لے کر آیا اُس نے بالکل الٹا کیا: **اپنے آپ سے علم غیب کی نفی کی، کہانت اور تعویذوں کو باطل کیا، ہر فرد کے ہاتھ میں مفت ہتھیار دے دیا، اور دم کرنے والے سے پہلے طبیب کا حکم دیا۔** جو ایسا کرے وہ اپنے لیے اقتدار نہیں بنا رہا - بلکہ وہ ایک پیغام پہنچا رہا ہے جو اُس کے سپرد کیا گیا۔



چھٹا باب

زبان کا اعجاز اور چیلنج

سب سے بڑا معجزہ نہ آسمان میں ہے نہ زمین میں... بلکہ خود کتاب میں ہے: ایک
کھلا چیلنج جو چودہ سو برس سے قائم ہے اور کسی کو اُسے قبول کرنے کی جرأت
نہ ہوئی۔

12 دلائل

تین درجے نیچے آنے والا چیلنج... پھر بھی قبول نہ ہوا

اور اگر تمہیں اُس کلام کے بارے میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے، تو اس

جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ، اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلا لو، اگر تم سچے ہو

سورہ بقرہ - آیت 23



چیلنج درجہ بہ درجہ نیچے آتا ہے، یہاں تک کہ کم سے کم ممکن حد پر آ جاتا ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے عربوں کو چیلنج دیا کہ اس جیسا کلام لے آئیں۔ وہ عاجز رہے تو تخفیف ہوئی: دس سورتیں۔ پھر بھی عاجز رہے تو مزید تخفیف: **صرف ایک سورت**، خواہ وہ تین چھوٹی آیتوں کی ہو۔ اور آج تک کوئی اُسے نہ لا سکا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عرب بلا شرکتِ غیرے اہل بیان تھے۔ شعر اُن کا دیوان اور اُن کا فخر تھا، عکاظ اور ذی المجاز میں اُس کے بازار لگتے تھے، یہاں تک کہ اُن کے بہترین قصیدوں کو بلندی مرتبہ کے سبب معلقات کہا گیا۔ اُنہی میں امرؤ القیس، زبیر، لبید اور طرفہ تھے۔ اور اس دعوت کو آسان ترین راستے سے گرانے کے وہ سب سے زیادہ محتاج تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

چودہ صدیاں گزر گئیں، لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی چیز ٹھہر نہ سکی۔ جو شخص مسیلمہ کذاب اور ابن المقفع وغیرہ کی طرف منسوب کلام پڑھے، وہ اُسے **مقابلہ نہیں بلکہ مذاق کا نشانہ** پائے گا۔ چیلنج آج بھی قائم ہے، اور آج وسائل کہیں بڑے ہیں: لسانی مجالس، جامعات، برقی لغات، اور اسلوب کا تجزیہ کرنے والے کمپیوٹر۔ اس کے باوجود ایک متن بھی ایسا پیش نہ ہوا جس کے بارے میں اہل زبان کہیں: یہ اُس جیسا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس چیلنج میں دو باتیں ایسی ہیں جو اسے منفرد بناتی ہیں۔ پہلی: **نیچے کی طرف تدریج** - یہ اُس کے اُلٹ ہے جو چیلنج دینے والا عموماً کرتا ہے۔ مبالغہ کرنے والا اپنے چیلنج کی حد اونچی رکھتا ہے تاکہ وہ ناقابلِ رسائی رہے؛ مگر اس نے اُسے نیچے اُتارا، یہاں تک کہ کم سے کم ممکن حد پر آ گیا: **ایک ہی سورت، خواہ وہ قرآن کی سب سے چھوٹی سورت ہو**۔ دوسری: اُس نے **ہر کسی سے مدد لینے کی اجازت دی**: «اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلا لو» - یعنی سب مل جاؤ اور جسے چاہو بلا لو۔ پھر ایک دوسری آیت میں نتیجہ پیشگی طے کر دیا: **«پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے»** - مستقبل پر ایسا قطعی حکم کوئی جوا کھیلنے والا نہیں لگا سکتا۔

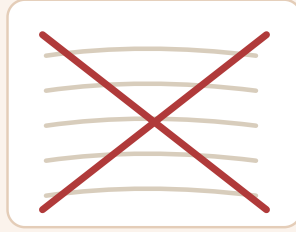
آپ اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے

اور آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اُسے لکھتے تھے، ورنہ باطل

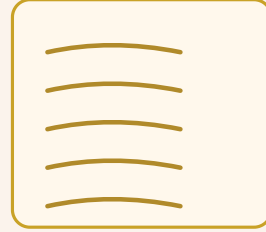
پرست ضرور شک میں پڑ جاتے

سورہ عنکبوت - آیت 48

اگر وہ پڑھتے لکھتے تو جھٹلانے والے کے پاس دلیل ہوتی



نہ پڑھتے ہیں نہ لکھتے ہیں



عربی زبان کی سب سے بلیغ کتاب

یہاں اُمّی ہونا نقص نہیں... بلکہ یہی دلیل ہے

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے، اور نہ کسی سے تعلیم پائی تھی۔ آیت اسی کا ذکر کرتی ہے اور اس کی وجہ بھی بتاتی ہے: اگر آپ پڑھتے لکھتے ہوتے تو لوگ شک کرتے اور کہتے: کتابوں سے نقل کر لیا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مگہ میں لکھنا پڑھنا کم تھا اور اُمّیت غالب تھی۔ اس کے باوجود مگہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو پڑھتے لکھتے تھے، اور جزیرہ عرب میں یہود و نصاریٰ تھے جن کے پاس کتابیں اور علما تھے۔ چنانچہ اگر نبی کریم ﷺ پڑھے لکھے ہوتے تو الزام تیار تھا اور اُس کا کوئی جواب نہ ہوتا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نبی کریم ﷺ کا اُمّی ہونا آپ کی سیرت کے سب سے زیادہ ثابت شدہ تاریخی حقائق میں سے ہے، اور آپ کے زمانے کے مخالفوں نے بھی اس میں جھگڑا نہ کیا - حالانکہ طعن کے سب سے بڑے حریص وہی تھے۔ اُنہوں نے اس کے سوا ہر الزام لگایا: شاعر کہا، جادوگر کہا، کاہن کہا، مجنون کہا، اور کہا «اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے» - تو قرآن نے جواب دیا: «جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں اُس کی زبان عجمی ہے، اور یہ صاف عربی زبان ہے»۔ یعنی جس شخص کی طرف اُنہوں نے اشارہ کیا، وہ عربی ہی اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قرآن یہاں وہ اعتراض خود پیش کرتا ہے جو اُس پر کیا جا سکتا تھا، پھر اُسے توڑ دیتا ہے۔ یہ طریقہ وہی اختیار کرتا ہے جو پورا بھروسا رکھتا ہو۔ آیت کہتی ہے: تعجب یہ نہیں کہ یہ کتاب عظیم ہے، بلکہ یہ کہ وہ ایسے شخص کی زبان سے آئی جو نہ پڑھتا ہے نہ لکھتا ہے۔ پھر معاملہ اور سنگین ہے: اس متن میں پچھلی اُمّتوں کی خبریں اور باریک تاریخی تفصیلات ہیں، میراث، عدالت اور جنگ کے مکمل احکام ہیں، اور ایسے کائناتی امور کا بیان ہے جو اُس وقت معلوم ہی نہ تھے۔ یہ سب ایسے شخص سے جو ایک سطر بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اور یہی اس فرمان کا مطلب ہے: «ورنہ باطل پرست ضرور شک میں پڑ جاتے» - یعنی آپ کی اُمّیت ہی وہ چیز ہے جس نے شک کا دروازہ بند کر دیا۔

تیئیس سال... اور ایک تضاد بھی نہیں

کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس

میں بہت سا اختلاف پاتے

سورہ نساء - آیت 82

واقعات پر متفرق نزول، نہ کہ ایک نشست کی تالیف

مکہ

سال 23

مدینہ

جنگ و امن میں • فقر و غنا میں • ضعف و قوت میں
اور خوشی و غم، ہجرت و محاصرے میں... اور ایک حرف میں تضاد نہیں

ایسی کتاب جو ایک نشست میں نہ لکھی گئی، نہ اُس پر نظر ثانی ہوئی

آسان لفظوں میں

قرآن تیئیس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا، حالات کے مطابق ایک آیت اور کئی آیتیں - جنگ میں اور صلح میں، تنگی میں اور خوشحالی میں۔ اس کے باوجود آپ کو اس میں نہ کوئی تضاد ملے گا، نہ منہج کی تبدیلی، نہ کسی پہلی بات سے رجوع۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کتابیں ایک نشست میں لکھی جاتی ہیں، پھر شائع ہونے سے پہلے اُن پر نظر ثانی اور اصلاح ہوتی ہے اور تضادات نکال دیے جاتے ہیں۔ قرآن اس کے برعکس نزول کے فوراً بعد لوگوں کو سنا دیا جاتا، وہ اُسے یاد کر لیتے اور لکھ لیتے، پھر گزری ہوئی بات میں ترمیم کا کوئی راستہ نہ رہتا۔ اور جو کچھ مگہ میں نازل ہوا، وہ ہجرت سے برسوں پہلے مخالفوں کے ہاتھ میں تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

آج کوئی بھی شخص خود اس کا امتحان لے سکتا ہے: وہ بیس سال تک تھوڑا تھوڑا کر کے ایسا متن لکھے جو عقیدہ، قانون، تاریخ، اخلاق، کائنات اور نفسِ انسانی سب پر بات کرے، پھر آخر میں اُس پر نظر ثانی کرے اور اُس میں کوئی تضاد نہ نکلے۔ محققین نے - مسلمان بھی اور غیر مسلم بھی - چودہ صدیوں تک قرآن میں تضاد ڈھونڈا، «مشکل قرآن» اور «تاویل مختلف الآیات» پر پوری پوری کتابیں لکھی گئیں، اور سب اسی نتیجے پر پہنچیں کہ جو اختلاف نظر آتا ہے وہ تنوع کا اختلاف ہے، تضاد کا نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت یہاں کوئی دعویٰ نہیں، بلکہ ایک قابلِ اطلاق علمی معیار پیش کرتی ہے۔ کہتی ہے: اگر یہ انسانی ہوتا تو تم اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ اور یہ منطقی طور پر درست ہے: جو متن بدلتے ہوئے حالات میں بیس سال پھیلا ہو، اُس میں اپنے کہنے والے کی بدلتی کیفیت کا اثر ضرور ہونا چاہیے۔ اور اس سے عجیب تر یہ کہ حالات بدلنے سے لہجہ نہ بدلا: عفو و رحمت کی آیتیں فتح کے بعد اُترتی ہیں، پہلے نہیں؛ اور ثابت قدمی اور وعدے کی آیتیں شکست اور محاصرے میں اُترتی ہیں۔ اگر یہ متن اپنے کہنے والے کی حالت کا عکس ہوتا تو اس کا الٹ متوقع تھا۔

ولید بن مغیرہ کی گواہی

اللہ کی قسم! اِس میں حلاوت ہے، اِس پر رونق ہے، اِس کا نچلا حصّہ شاداب ہے اور اوپر کا حصّہ پھل دار،
اور یہ کوئی انسان نہیں کہہ سکتا

حاکم اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا — کتبِ سیرت میں مشہور

یہ قریش کے سب سے دانا اور سب سے سخت دشمن نے کہی

«اس میں شیرینی ہے... اور اس پر رونق ہے»

«اس کا نیچا حصّہ سیراب، اور اوپری حصّہ پھل دار»

«یہ کسی بشر کا کلام نہیں»

«پھر پلٹ کر بولا: «یہ تو بس نقل ہوتا چلا آیا جادو ہے»

حقیقت کا اعتراف کیا... پھر وہ بات کہی جو قوم کو خوش کرے

آسان لفظوں میں

ولید بن مغیرہ قریش کے ذہین ترین اور کلام کے سب سے بڑے پارکھ لوگوں میں سے تھا، اور دعوت کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھا۔ جب اُس نے قرآن سنا تو نہایت خوبصورت تعریف کی اور کہا: «یہ کوئی انسان نہیں کہہ سکتا»۔ پھر اُس کی قوم نے دباؤ ڈالا تو کہنے لگا: «یہ تو بس ایک جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آیا ہے»۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قریش حج کے موسم سے پہلے کوئی ایک بات ڈھونڈ رہے تھے جو حاجیوں سے محمد ﷺ کے بارے میں کہیں، چنانچہ وہ ولید کے پاس جمع ہوئے، کیونکہ وہ اُن میں سب سے زیادہ سمجھ دار اور شعر و بیان کا سب سے بڑا جاننے والا تھا۔ اُنہوں نے اُس کے سامنے رکھا: کاہن؟ مجنون؟ شاعر؟ جادوگر؟ — اُس نے یہ سب رد کر دیے، اور دلیلیں خود فِی کلام ہی سے لایا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ واقعہ کتبِ سیرت و تفسیر میں مشہور ہے، اور اُسی کے بارے میں سورہ مدثر کی یہ آیتیں اُتریں: «اُس نے سوچا اور اندازہ لگایا ۝ سو وہ مارا جائے، کیسا اندازہ لگایا ۝ پھر وہ مارا جائے، کیسا اندازہ لگایا ۝ پھر اُس نے دیکھا ۝ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑا ۝ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا ۝ پھر کہا: یہ تو بس ایک جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آیا ہے»۔ آیتیں اُس کی نفسیاتی کیفیت کا نہایت باریک نقشہ کھینچتی ہیں: سوچ، پھر اندازہ، پھر نظر، پھر تیوری، پھر پیٹھ پھیرنا اور تکبر، پھر وہ فیصلہ جس سے اُس نے قوم کو راضی کیا۔ اور کہانت اور شعر کو رد کرنے کی اُس کی دلیلیں تفصیل کے ساتھ اُسی سے منقول ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

مخالف کی گواہی سب سے مضبوط گواہی ہوتی ہے، خاص کر جب وہ اُسی میدان کا ماہر ہو جس میں گواہی دے رہا ہے۔ اور ولید شعر کا وہ حکم تھا جس کے سامنے قصیدے پیش کیے جاتے تھے۔ اُس نے قرآن اور ہر اُس چیز کے درمیان جو ظاہراً اُس سے ملتی جلتی تھی، ایک باریک فنی فرق کیا: شعر کے بارے میں کہا: «میں نے شعر کی ساری قسمیں جان رکھی ہیں... یہ شعر نہیں»، اور کہانت کے بارے میں کہا: «یہ کاہن کی زمزمہ خوانی ہے نہ اُس کا سجع»۔ پھر اُس کی ساخت بیان کی: «اِس کا نچلا حصّہ شاداب ہے اور اوپر کا حصّہ پھل دار» — یعنی اِس کا ظاہر خوبصورت ہے اور باطن معنی سے بھرپور۔ یہ کسی چاہنے والے کی تعریف نہیں، ایک دشمن ماہر کا فنی تجزیہ ہے۔ پھر قوم کے دباؤ کے بعد اُس کا اپنی بات سے پھر جانا — جو خود قرآن میں درج ہے — کھول دیتا ہے کہ جھٹلانا ایک سماجی موقف تھا، عقلی یقین نہیں۔

نہ شعر، نہ نثر، نہ کاہنوں کا سجع

اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں — تم بہت کم ایمان لاتے ہو ﴿﴾ اور نہ کسی کاہن کا کلام — تم

بہت کم نصیحت پکرتے ہو

سورہ حاقہ — آیات 41-42

شعر	نثر	سجع	قرآن
_____	_____	_____	_____
_____	_____	_____	_____
_____	_____	_____	_____
وزن اور قافیہ	بے وزن	بناوٹی سجع	الگ ہی ایک صنف
✗	✗	✗	✓

خود اہل زبان اسے کسی صنف میں نہ رکھ سکے

ایسا متن جو عربی کے کسی معروف سانچے میں نہیں سماتا

آسان لفظوں میں

عربی میں بلند کلام کی تین صورتیں تھیں: **شعر** اپنے اوزان کے ساتھ، **نثر**، اور **کاہنوں کا سجع**۔ اور قرآن ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں — بلکہ اپنی الگ صنف ہے جو خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عرب روئے زمین پر شعر کے اوزان، بحروں اور قافیوں کے سب سے بڑے جاننے والے تھے، شعر کی شکستگی کو طبیعت سے پہچان لیتے تھے۔ وہ کاہنوں کا سجع بھی جانتے تھے اور اُس کے تکلف پر ہنستے تھے۔ اس کے باوجود قرآن کے بارے میں اُن کی بات سخت ڈانواں ڈول رہی: کہا شعر ہے، پھر جادو، پھر کہانت، پھر پہلے لوگوں کی کہانیاں — اور ہر رائے پچھلی رائے کو توڑ دیتی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قرآن شعر سے مختلف ہے، کیونکہ وہ نہ کسی وزن پر چلتا ہے نہ کسی پابند قافیے پر؛ نثر سے مختلف ہے، کیونکہ اُس میں اندرونی آہنگ اور باقاعدہ فواصل ہیں؛ اور سجع سے مختلف ہے، کیونکہ کاہنوں کے سجع میں فاصلے کی خاطر لفظ میں تکلف کیا جاتا ہے، جبکہ قرآن کے فواصل معنی کے تابع آتے ہیں، اُس پر حاکم نہیں ہوتے۔ فاصلے اور کاہنوں کے سجع کا یہ فرق عربی بلاغت کے علما کے ہاں ایک طے شدہ مبحث ہے۔ اور مستشرق آبری نے کہا کہ قرآن کی بلاغت اور آہنگ اس قدر قوی اور مؤثر ہیں کہ ہر ترجمہ اصل کی رونق کا ایک پھیکا عکس ہی رہ جاتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

درجہ بندی میں مخالفوں کا یہی اضطراب دلیل ہے۔ جب کسی فن کے ماہر ایک متن کو اپنے فن کے کسی باب میں رکھ نہ سکیں، اور ایک مجلس سے دوسری مجلس تک اُن کی بات خود اپنے آپ کو کاٹتی رہے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اُس صنف سے باہر ہے جسے وہ جانتے ہیں۔ اور قرآن نے یہی اضطراب اُن پر درج کیا: «دیکھیے اُنہوں نے آپ کے لیے کیسی مثالیں بیان کیں، پس وہ بھٹک گئے»۔ پھر انہیں اُسی معیار پر للکارا جس کے وہ ماہر تھے: نہ تلوار سے، نہ مال سے، بلکہ اُسی صنعت سے جس میں وہ روئے زمین کے سب لوگوں سے بڑھ کر تھے۔ اور جو شخص کوئی کتاب گھڑتا ہو، وہ اپنے مخالفوں کو اُسی میدان میں للکارنے کا جوا نہیں کھیلتا جس میں وہ سب سے آگے ہوں۔

ایسی کتاب جو اپنے لانے والے پر عتاب کرتی ہے

اُس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا ﴿﴾ کہ اُس کے پاس نابینا آگیا ﴿﴾ اور آپ کو کیا خبر، شاید وہ

پاکیزگی حاصل کرتا

سورہ عبس - آیات 1-3

ایسی آیتیں جن میں نبی ﷺ پر کھلا عتاب ہے

«تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا» • «اللہ آپ کو معاف کرے، انہیں اجازت کیوں دی؟»
«نبی کے لیے قیدی رکھنا مناسب نہیں» • «اور آپ دل میں چھپا رہے تھے»

پھر نماز میں لوگوں کے سامنے باآواز بلند پڑھی جاتی ہیں

اور یاد کی جاتی ہیں، لکھی جاتی ہیں، مٹی نہیں

جو کتاب گھڑتا ہے، وہ اُس میں اپنی ملامت نہیں رکھتا

آسان لفظوں میں

قرآن میں ایسی آیتیں ہیں جو **خود نبی کریم ﷺ پر عتاب کرتی ہیں** اور آپ کا ایک موقف درست کرتی ہیں۔ یہ آیتیں نماز میں بلند آواز سے لوگوں کو سنائی جاتی ہیں، چھوٹے بڑے انہیں یاد کرتے ہیں، اور نہ کبھی حذف ہوئیں نہ ہلکی کی گئیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جو نبوت کا دعویٰ کرے، اُسے **ایک مکمل اور بے عیب تصویر** چاہیے۔ اور اُس کے دشمن ہر لغزش کی تاک میں رہتے ہیں۔ تو ایسا متن اُترنا جو اُس پر عتاب کرے اور اُس کے اجتہاد کو غلط ٹھہرائے، پھر مسجد میں سب کے سامنے پڑھا جائے - یہ ہر سیاسی اور نفسیاتی حساب کے خلاف ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مثالیں بہت ہیں اور صاف ہیں: **پوری سورہ عبس اُس وقت کے عتاب میں ہے جب آپ ایک نابینا سے منہ پھیر کر سردارانِ قریش کی طرف متوجہ ہوئے؛ اور «اللہ آپ کو معاف کرے، آپ نے انہیں اجازت کیوں دی؟» تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کو اجازت دینے پر؛ اور «کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ اُس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں خوب خون نہ بہا لے» بدر کے قیدیوں کے بارے میں؛ اور «اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپاتے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اُس سے ڈریں»؛ اور «آپ کیوں حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا»۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر نبی کریم ﷺ وحی میں سے کچھ چھپانے والے ہوتے تو یہی آیت چھپا لیتے۔**

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ اس باب کی سب سے مضبوط عقلی دلیلوں میں سے ہے، اور مؤرخین کے ہاں اسے **«معیارِ شرمندگی»** کہا جاتا ہے: جو متن اپنے ناقل کے مفاد کو نقصان پہنچائے، وہ سچائی سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اور دیکھیے کہ عتاب کسی حاشیائی مسئلے میں نہیں ہوا، بلکہ **بڑے سیاسی اور فوجی فیصلوں میں** ہوا: قیدیوں کے ساتھ برتاؤ، منافقوں کو اجازت، اور گھر کا ایک ذاتی معاملہ۔ اس پر ایک اور تفصیل بھی شامل کر لیجیے: قرآن نے **کچھ سوالوں کا جواب دیا اور کچھ کا نہیں دیا**، بلکہ واقعہٴ اُفک میں، جب آپ کی زوجہ پر تہمت تھی، نبی کریم ﷺ سے وحی پورا ایک مہینہ رُک رہی، یہاں تک کہ لوگوں نے جو کہنا تھا کہہ لیا۔ اگر معاملہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہوتا تو ایک دن بھی تاخیر نہ ہوتی۔

آپ ﷺ کا کلام قرآن سے کبھی نہیں ملتا

اور وہ خواہش سے نہیں بولتے یہ تو بس ایک وحی ہے جو اُتاری جاتی ہے

سورہ نجم – آیات 3-4

قرآن



آہنگ، فواصل اور خاص ساخت

حدیث شریف



ایک فصیح انسان کی بلاغت... بغیر اُس ساخت کے

ایک ہی آدمی... اور دو اسلوب جو کسی پر خلط نہیں ہوتے

اسلوبی تجزیہ دونوں میں بغیر کسی دقت کے فرق کر دیتا ہے

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ عربوں میں سب سے زیادہ فصیح تھے، اور آپ کی احادیث بلاغت کی چوٹی پر ہیں۔ اس کے باوجود آپ کی حدیث کسی کو بھی کبھی قرآن سے مشتبہ نہیں ہوئی – دونوں اسلوب صاف طور پر الگ ہیں، اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ کوئی حدیث قرآن کی طرف منسوب ہو گئی ہو۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اگر قرآن آپ ﷺ کی اپنی تالیف ہوتا تو آپ کے پورے کلام میں ایک ہی اسلوب ہوتا – کیونکہ انسان ایک اسلوبی نقش رکھتا ہے جس سے وہ چھوٹ نہیں سکتا، خاص کر بیس سال کے عرصے میں۔ اور آپ کے صحابہ روزانہ دونوں سنتے تھے، مگر ایک لمحے کے لیے بھی اُن پر دونوں کا معاملہ خلط نہ ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اسلوبی تجزیہ (Stylometry) آج ایک قائم علم ہے، جس میں الفاظ کی تقسیم، جملوں کی لمبائی اور تراکیب کی ساخت ناپ کر متن اُس کے لکھنے والے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ قرآن اور حدیث پر لاگو ہوا تو دونوں کا واضح فرق سامنے آ گیا۔ ساخت میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے: قرآن **باقاعدہ فواصل**، التفات اور ضمیروں کے درمیان نقل و حرکت پر قائم ہے، اور حدیث اس بناوٹ پر نہیں چلتی۔ پھر قرآن خود نبی کریم ﷺ کو امر، نہی اور عتاب کے صیغے میں مخاطب کرتا ہے اور آپ کو حکم دیتا ہے کہ «کہہ دیجیے» – تین سو سے زیادہ بار۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس پر ایک تیسری قسم بھی شامل کر لیجیے: **حدیث قدسی** – یعنی وہ کلام جو نبی کریم ﷺ اپنے رب سے بامعنی نقل کرتے ہیں، اور اس کے باوجود وہ قرآن شمار نہیں ہوتی اور نماز میں نہیں پڑھی جاتی۔ تو ہمارے پاس کلام کے تین درجے ہیں جو ایک ہی شخص کی زبان سے نکلے، اور حکم اور برتاؤ میں اُن کے درمیان قطعی فرق کیا جاتا ہے: قرآن کی تلاوت عبادت ہے، اُسی سے چیلنج دیا جاتا ہے، اور وہ حرف بہ حرف تواتر سے منقول ہے؛ حدیث قدسی معنی میں اللہ کی طرف منسوب ہے اور نبی کریم ﷺ کے اپنے الفاظ میں روایت ہوتی ہے؛ اور حدیث نبوی خود آپ کا کلام ہے۔ یہ **باریک سہ گانہ تمیز** پہلے دن سے قائم ہے اور کبھی گڈمڈ نہیں ہوئی۔ اور اگر یہ سب ایک ہی انسانی سرچشمے سے ہوتا تو بیس سال تک یہ جدائی برقرار رکھنا ممکن نہ تھا۔

اور قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے

❖ اور اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے، تاکہ تم بچتے رہو ❖

سورہ بقرہ - آیت 179

عرب کا سب سے بلیغ کلام

«قتل ہی قتل کو زیادہ روکتا ہے»

حرف 14

اور قرآن نے کہا

«اور قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے» →

حروف کم... اور معنی زیادہ

اس میں زندگی ہے، محض قتل کی نفی نہیں۔ اور مقصد بتایا، ذریعہ نہیں اور اسے عادلانہ قصاص سے مقید کیا، مطلق قتل سے نہیں

سینکڑوں مثالوں میں سے ایک، جنہیں علمائے بلاغت پڑھتے ہیں

آسان لفظوں میں

اس مضمون میں عرب جس فقرے پر سب سے زیادہ فخر کرتے تھے، وہ یہ تھا: «قتل ہی قتل کو سب سے زیادہ مٹاتا ہے»۔ پھر قرآن ایسا جملہ لے کر آیا جو **حروف میں کم اور معنی میں کہیں زیادہ** ہے: «اور قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے»۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

«قتل ہی قتل کو سب سے زیادہ مٹاتا ہے» عربوں کے ہاں ایجاز کی چوٹی شمار ہوتا تھا اور بطور مثال پیش کیا جاتا تھا۔ وہ بڑے بڑے معانی کو تھوڑے لفظوں میں سمیٹنے کا مقابلہ کرتے تھے، اور اسے فصاحت کا سب سے اونچا درجہ سمجھتے تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

علمائے بلاغت نے دونوں کا فرق کھنگالا تو سات یا اس سے زیادہ پہلو نکلے۔ سب سے نمایاں یہ: قرآن نے **زندگی** کا ذکر کیا، جو مطلوب و محبوب غایت ہے، اور مثال میں قتل کا ذکر تھا جو ناپسندیدہ ہے؛ قرآن نے اُسے «**قصاص**» کے ساتھ مقید کیا، یعنی عادلانہ اور جائز قتل، جبکہ مثال نے قتل کو مطلق چھوڑا تو اُس میں ظلم بھی آگیا؛ قرآن نے **پورے معاشرے کے لیے ایک مسلسل زندگی** ثابت کی، محض ایک صورت کی نفی نہیں؛ اور اُس میں لفظ «قتل» دو بار دہرانے کی نوبت نہ آئی؛ اور وہ اخلاقی غایت پر ختم ہوا: «تاکہ تم بچتے رہو»۔ یہ سب کم حروف میں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں اہم صرف یہ ایک مثال نہیں، بلکہ **یہ کہ یہ کوئی استثنا نہیں ہے**۔ عربی بلاغت کے سارے علوم - معانی، بیان اور بدیع - اصل میں اسی متن کے اعجاز کی تشریح میں پیدا ہوئے، اور ان میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں: باقلانی کی «اعجاز القرآن» سے لے کر عبدالقادر جرجانی کی «دلائل الاعجاز» اور «اسرار البلاغہ» تک۔ یعنی **ایک پورا انسانی علم صرف ایک کتاب کے تجزیے کے لیے کھڑا ہوا** - اور روئے زمین کی کسی زبان کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اور محققین آج تک اس سے وہ کچھ نکال رہے ہیں جو اُن سے پہلے والے نہ نکال سکے۔

مجھے جوامعُ الکلم دے دیے گئے

مجھے جوامعُ الکلم دے کر بھیجا گیا ہے

بخاری و مسلم نے روایت کیا — متفق علیہ

«دین خیرخواہی ہے»

«نہ نقصان اٹھانا نہ پہنچانا»

«اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے»

«مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں»

چند کلمات... جن پر فقہ کے پورے پورے ابواب کھڑے ہوئے

کلی قواعد، جو ہزاروں مسائل کو ترتیب دیتے ہیں

آسان لفظوں میں

نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ **تھوڑے لفظ کہتے اور اُن میں بہت سا معنی ہوتا**۔ چند لفظوں کی احادیث پر فقہ اور قانون کے پورے پورے باب کھڑے کیے گئے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مختصر حکمت ہر قوم میں معروف ہے: عربوں کی امثال، ہند کی حکمتیں، یونان کے مواظ۔ لیکن یہ **عام اخلاقی نصیحتیں** ہیں، ایسے قواعد نہیں جن پر ایک مکمل قانونی نظام کھڑا ہو۔ اور حکمت اور فقہی قاعدے کا فرق بنیادی فرق ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ایک ہی مثال لیجیے: «**لا ضرر ولا ضرار**» یعنی نہ نقصان اٹھانا ہے نہ نقصان پہنچانا — عربی میں صرف چار لفظ۔ اِن پر اسلامی فقہ کا ایک پورا باب کھڑا ہوا، جو پڑوس، تعمیر، طلاق، بیع، شفعہ، غصب، ملکیت اور مالک کے حق کی تحدید تک کو سمیٹتا ہے۔ اور یہ اُن **پانچ بڑے قواعد** میں شمار ہوا جن پر تمام فقہی مذاہب گھومتے ہیں۔ اور اِسی جیسا «**إنّما الاعمال بالنیّات**» ہے، جسے ائمہ نے تہائی علم قرار دیا، اور امام شافعی نے کہا کہ یہ فقہ کے ستر ابواب میں داخل ہوتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایسا **کلی قاعدہ گھڑنا جو جامع بھی ہو اور مانع بھی**، کسی طویل متن کے لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ قاعدے کو ہر اُس چیز کو سمیٹنا ہوتا ہے جو اُس کے تحت آتی ہے، اور ہر اُس چیز کو باہر رکھنا ہوتا ہے جو نہیں آتی، اور ایسی صورتوں کے سامنے بھی ٹھہرنا ہوتا ہے جو اُس کے کہنے والے کے وہم میں بھی نہ تھیں۔ آج قانون ساز اِسی پر محنت کرتے ہیں تو اُن کے متن جلدوں میں نکلتے ہیں، پھر ہر سال اُن میں ترمیم ہوتی ہے۔ مگر چار لفظوں کا ایک متن چودہ صدیوں تک قائم رہے، اور ایسے نئے مسائل کو بھی سمیٹ لے جو اُس وقت موجود ہی نہ تھے — جیسے صنعتی آلودگی اور برقی نقصان — تو یہ ٹھہر کر سوچنے کی چیز ہے۔ اور دیکھیے کہ حدیث خود اِسے کسب نہیں بلکہ عطا کہتی ہے: «**مجھے بھیجا گیا جوامعُ الکلم کے ساتھ**»۔

لاکھوں سینوں میں محفوظ کتاب

بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں، اُن لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا

سورہ عنکبوت – آیت 49

انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ زبانی یاد کی گئی کتاب



ہر براعظم اور ہر نسل میں لاکھوں حفاظ

ہر سینے میں ایک زندہ نسخہ – نہ جلایا جا سکے، نہ بدلا جا سکے

آسان لفظوں میں

قرآن صرف کتابوں میں محفوظ نہیں ہوا – بلکہ **لوگوں کے سینوں میں**۔ اور چودہ صدیوں سے ہر نسل میں لاکھوں انسان اُسے یاد کرتے آئے ہیں، جن میں ایسے بچے بھی ہیں جو عربی بولتے ہی نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پرانی کتابیں گئے چنے نسخوں میں کاہنوں اور علما کے پاس رہتی تھیں۔ کتب خانہ جل جاتا یا نسخہ گم ہو جاتا تو کتاب ہی ختم ہو جاتی – اور بہت سی کتابوں کے ساتھ یہی ہوا، جو اب صرف اپنے ناموں سے جانی جاتی ہیں۔ اور اُمیت کسی بھی متن کے پھیلنے میں رکاوٹ تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قرآن کے حافظوں کی تعداد آج لاکھوں میں شمار کی جاتی ہے – انڈونیشیا، نائجیریا، ترکی، پاکستان، عرب ممالک، یورپ اور امریکہ میں۔ اُن کے لیے بین الاقوامی مقابلے ہوتے ہیں، جن میں وہ ضبط اور تجوید کے ساتھ حرف بہ حرف حفظ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور **اُن میں اکثر غیر عرب ہیں** – یعنی وہ ایسا متن یاد کرتے ہیں جو اُن کی مادری زبان میں نہیں۔ اور انسانی تاریخ میں کوئی دوسری کتاب معلوم نہیں جو اتنی کثرت اور اتنی باریکی کے ساتھ یاد کی گئی ہو۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دلالت کا اصل مقام یہ ہے کہ اس کا اثر **تحریف کے ناممکن ہونے** پر پڑتا ہے۔ جو متن صرف کتابوں میں محفوظ ہو، نسخوں پر قابو پا کر اُسے بدلا جا سکتا ہے۔ مگر جس متن کو دور دراز براعظموں میں لاکھوں انسان یاد کیے بیٹھے ہوں، جنہیں نہ کوئی ایک حکومت جمع کرتی ہے، نہ ایک زبان، نہ ایک ریاست، اور جو ہر دن پانچ بار نماز میں پڑھا جاتا ہو – اُس کا ایک حرف بدلنا **عملاً محال ہے**، کیونکہ وہ پہلی ہی باجماعت نماز میں پکڑا جائے گا۔ اور آیت اسی کی طرف باریکی سے اشارہ کرتی ہے: «روشن آیتیں **سینوں میں**» – «صحیفوں میں» نہیں کہا۔ اور یہ اُس فرمان کی عملی تصدیق ہے: «بے شک ہم نے ہی یہ ذکر اُتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں» – ایک ایسے انسانی طریقے سے جسے دیکھا اور گنا جا سکتا ہے۔

ہر آیت کا خاتمہ اُس کے مناسب

اور اللہ زبردست حکمت والا ہے ﴿﴾ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ﴿﴾ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

قرآن میں جا بجا آنے والے خاتمے

ایک خاتمہ دوسرے سے بدل دیں تو معنی بگڑ جائے

سياقِ سزا و قدرت

«عزیزٌ حکیم»



سياقِ توبہ و مغفرت

«غفورٌ رحیم»



سياقِ دعا و شکایت

«سمیعٌ علیم»



چھ ہزار سے زیادہ آیتیں... اور ہر خاتمہ اپنی جگہ

آیت کے مضمون اور اُس اسمِ الہی کے درمیان باریک ہم آہنگی جس پر وہ ختم ہوتی ہے

آسان لفظوں میں

قرآن کی اکثر آیتیں اللہ کے دو اسمائے حسنیٰ پر ختم ہوتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر خاتمہ اپنی آیت کے موضوع سے ٹھیک ٹھیک میل کھاتا ہے — آپ ایک خاتمے کی جگہ دوسرا رکھ کر دیکھیے، فوراً محسوس ہوگا کہ کچھ بگڑ گیا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عربی شاعری پورے قصیدے میں ایک ہی قافیہ نہاتی ہے، اور اکثر لفظ اُسی قافیے کی خاطر تکلف میں پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ شعر ایسے لفظ سے بھر دیا جاتا ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔ یہ وہ عیب ہے جسے نقاد پہچانتے ہیں۔ اور کابنوں کی مسجع عبارت تو اِس سے کہیں زیادہ متکلف تھی۔ سو توقع یہی تھی کہ فاصلوں والے کسی بھی متن میں یہی تکلف آ جائے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قرآن میں معاملہ بالکل اُلٹا ہے: فاصلہ معنی کے تابع ہے، اُس پر حاکم نہیں۔ سزا اور انتقام کی آیت «عزیزٌ ذو انتقام» پر ختم ہوتی ہے، توبہ کی آیت «غفورٌ رحیم» پر، اور دعا کی آیت «سمیعٌ علیم» پر — کیونکہ دعا مانگنے والے کو یہی درکار ہے کہ اُس کی سنی جائے اور اُس کا حال جانا جائے۔ اِس باریکی کی سب سے مشہور مثال: چوری کی آیت «عزیزٌ حکیم» پر ختم ہوتی ہے — حد نافذ کرنے میں عزت اور اُس کے مقرر کرنے میں حکمت؛ اور جب اُس کے بعد توبہ کی آیت آتی ہے تو وہ «غفورٌ رحیم» پر ختم ہوتی ہے۔ اِسی موضوع پر «علم فواصل» کے نام سے پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ تجربہ خود کر کے دیکھیے: کسی بھی زبان سے کوئی لمبا مقفیٰ متن لیجیے اور جانچیے کہ کیا ہر قافیہ اپنے جملے کے مضمون سے ٹھیک ٹھیک میل کھاتا ہے۔ آپ کو یقیناً ایسے مقامات ملیں گے جو وزن یا قافیے کی خاطر بھر دیے گئے — اور انسانی کام میں یہ فطری ہے۔ قرآن میں چھ ہزار سے زیادہ آیتیں ہیں، جن میں سے اکثر کسی فاصلے پر ختم ہوتی ہیں، اور یہ تئیس برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا، بغیر کسی مسودے اور نظر ثانی کے۔ اتنی بڑی تعداد میں، اور نزول کے اِس انداز کے ساتھ، یہ ہم آہنگی قائم رہے — اِسے کسی لسانی مہارت سے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، سمجھایا نہیں جا سکتا۔

اور اب... آپ اس سب کا کیا کریں گے؟

ہم عنقریب اُنہیں اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اُن کے نفسوں میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے کہ یہی حق ہے۔ کیا آپ کے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں؟

سورہ فصلت - آیت 53

15

آسمان

16

زمین

22

زندگی

24

تاریخ

18

غیب

بہت سے الگ الگ دھاگے... سب ایک ہی سمت اشارہ کرتے ہیں
ان کے اتفاقاً جمع ہونے کا امکان صفر کے قریب

آپ سے کسی ایک دلیل کو ماننے کو نہیں کہا جا رہا... بلکہ اُن سب کو مل کر دیکھنے کو

آسان لفظوں میں

آپ کتاب کے آخر تک پہنچ گئے۔ جو دلیل بھی آپ کے سامنے سے گزری، اُس پر تنہا بحث کی جا سکتی ہے۔ مگر اصل سوال یہ ہے: **ان سب کا ایک ہی شخص میں اتفاقاً جمع ہو جانا کتنا ممکن ہے؟**

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تاریخ کی ہر قوم کے پاس کچھ نہ کچھ ایسا تھا جسے وہ بڑا مانتی تھی۔ مگر فرق کرنے والا سوال یہ ہے: کیا اُس کے پاس کچھ ایسا تھا جسے **جانچا اور جھٹلایا جا سکے؟** داستانیں نہ کوئی وقت کی پابند پیش گوئی پیش کرتی ہیں، نہ کائنات کا ایسا بیان جو اپنے زمانے کے علم کے خلاف ہو، اور نہ کوئی کھلی للکار جو چودہ صدیاں قائم رہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جو کچھ آپ نے یہاں پڑھا وہ پانچ بالکل الگ الگ دھاگے ہیں، ان میں سے کوئی دوسرے پر منحصر نہیں: **کائنات کا ایک بیان** جو اپنے عہد کے علم کے خلاف تھا اور صدیوں بعد علم نے اُس کی تصدیق کی؛ **آثارِ قدیمہ کی گواہیاں** جو انکار کے بعد زمین کے نیچے سے نکلیں؛ **وقت کی پابند اور متعین پیش گوئیاں** جو جیسے کہی گئی تھیں ویسے ہی پوری ہوئیں؛ **خود مخالفوں کی اپنی کتابوں کے متن** جو آج بھی اُنہی کے ہاتھوں میں ہیں؛ اور ایک **کھلی لسانی للکار** جو قبول نہ کی گئی۔ ایک دھاگا گر بھی جائے تو باقی چار قائم رہتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں کی دلیل **مستقل شہادتوں کے جمع ہو جانے** کی دلیل ہے، اور یہی عدالت اور علم دونوں میں چلتی ہے۔ ایک دلیل شاید ممکن ہو، دو شاید اتفاق ہوں؛ مگر ایسے میدانوں سے درجنوں دلیلیں جن کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں - فلکیات، ارضیات، طب، آثارِ قدیمہ، تاریخ اور زبان - اور سب کی سب ایک ہی طرف اشارہ کریں، تو یہ اتفاق سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اور قرآن آپ سے اندھی تقلید نہیں مانگتا؛ بلکہ سات سو سے زیادہ مقامات پر آپ کو دیکھنے اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہے: «کیا وہ دیکھتے نہیں؟»، «کیا وہ غور نہیں کرتے؟»، «کیا وہ عقل نہیں رکھتے؟»، «کہہ دیجیے: اپنی دلیل لاؤ»۔ اور جس کا وعدہ کیا تھا وہ آپ کے سامنے رکھ دیا: **«ہم عنقریب اُنہیں اپنی نشانیاں آفاق میں اور اُن کے نفسوں میں دکھائیں گے»**۔ اور آپ نے دیکھ لیا۔ باقی تنہا آپ پر چھوڑا گیا ہے۔

اختتامیہ

آپ راستے کے آخر تک پہنچ گئے۔ اور شاید اختتام پر کہنے کی سب سے اہم بات وہی ہے جو کہی نہیں جاتی: یہ کتاب آپ کو کسی چیز کا پابند نہیں کرنا چاہتی، بلکہ آپ کے سامنے وہ کچھ رکھنا چاہتی ہے جو غور کیے جانے کے لائق ہے۔

تین نصیحتیں، اگر آپ یہ راہ جاری رکھنا چاہیں

- اپنے ایمان کی بنیاد کسی ایک دلیل پر نہ رکھیے۔ ہر تنہا دلیل پر بحث ہو سکتی ہے اور اُسے کمزور کیا جا سکتا ہے۔ طاقت اُن کے مجموعے میں ہے، تنہا افراد میں نہیں — بہت سے دھاگوں سے بٹی ہوئی رسی کی طرح: ہر دھاگا اکیلا ٹوٹ جاتا ہے، اور سب مل کر پہاڑ اٹھا لیتے ہیں۔
- اور سائنس کو وحی پر حاکم نہ بنائیے۔ سائنس بدلتی رہتی ہے اور اُس کے نظریے ٹوٹتے رہتے ہیں، اور یہ اُس کا شرف ہے، عیب نہیں۔ اگر کوئی قطعی متن کسی ثابت شدہ علمی حقیقت سے موافق ہو جائے تو یہ ایک گواہی ہے جو ذکر کے لائق ہے؛ اور اگر موافق نہ ہو تو دیکھیے: کیا یہ ثابت شدہ حقیقت ہے یا ایسا نظریہ جس پر نظرِ ثانی ہو رہی ہے؟ اور کیا یہ قطعی الدلالت متن ہے، یا ہماری اپنی سمجھ ہے جس میں گنجائش ہے؟
- اور خود قرآن پڑھیے۔ اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ سب اصل کی طرف اشارے ہیں۔ اور جو دوا کا اثر جاننا چاہے اُسے وہ پینی چاہیے، نہ کہ پرچہ پڑھ لینے پر اکتفا کرے۔

» کہہ دیجیے: میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں: یہ کہ تم اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک کھڑے ہو جاؤ، پھر غور کرو۔«

اور ہماری آخری بات یہ ہے کہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے؛ اور اللہ کی رحمت و سلامتی ہو ہمارے نبی محمد پر، اور آپ کی آل اور آپ کے تمام صحابہ پر۔

یہ خبریں کہاں سے آئیں؟

اس کتاب کا ہر متن اپنے صفحے پر اپنے مأخذ کی طرف منسوب ہے۔ اور یہ اُن اصولوں کا خلاصہ ہے جن پر اعتماد کیا گیا، تاکہ قاری خود اُن کی جانچ کر سکے۔

پہلے: شرعی متون

- **قرآن کریم** – ہر جگہ سورہ کے نام اور آیت کے نمبر کے ساتھ۔
- **صحیح بخاری اور صحیح مسلم** – یہ کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح دو کتابیں ہیں، اور اس کتاب کی بیشتر احادیث انہی دونوں سے ہیں یا اُن پر متفق علیہ ہیں۔
- **سنن اور مسانید** – ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، موطأ مالک اور صحیح ابن حبان – ہر حدیث کا وہ درجہ بیان کرتے ہوئے جو اہل علم کے ہاں ہے۔

دوسرے: طبیعی علوم اور آثار

- **فلکیات اور طبیعیات** – نظریہ عظیم دھماکا، کائنات کا پھیلاؤ، نبض دار ستارے، کائناتی جال، بلیک ہول، کائنات کے ثوابت کی باریک تنظیم۔
- **ارضیات اور بحری علوم** – ارضی پلیٹیں، پہاڑوں کی جڑیں، وسط سمندر کا سلسلہ، آبی حرارتی دراڑیں، اندرونی لہریں، پانی میں روشنی کا جذب۔
- **طب اور جنین کا علم** – جنین کے بننے کے مراحل جیسا کہ معتبر جامعاتی مراجع میں ہے، قشر پیش پیشانی کے کام، جلد میں درد کے وصول کنندے، عالمی ادارہ صحت کی سفارشات۔
- **آثار اور تاریخ** – قاہرہ کے عجائب گھر کی مومیائیں، قدیم مصر کے نقوش، مدائن صالح، الشِصر (اُوبار) کا مقام، بند مآرب، نجران کے جمیری کتبے، مخطوطہ برمنگھم۔

تیسرے: اہل کتاب کی کتابیں

اس کتاب میں تورات اور انجیل کے متون معتمد عربی ترجمے (فان ڈاٹک) سے نقل کیے گئے ہیں، سفر، باب اور آیت کے نمبر کے ساتھ، اور جہاں اس کا موقع تھا وہاں عبرانی یا یونانی متن کی طرف اشارے کے ساتھ۔ اور یہ ہر قاری کی دسترس میں ہیں تاکہ وہ خود اُن کی جانچ کر سکے۔